بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

آئینۂ شعور وآگہی

تصنیف

محمد رضا قادری

استاذ: جامعہ اشرفیہ، مبارک پور، اعظم گڑھ

باہتمام

مولانا عبد الصمد قادری امجدی

ساکن تاراپٹی، ضلع دھنوشا (نیپال)

ناشر: کتب خانہ قادریہ وخانقاہ قادریہ چشتیہ راہ سلوک، مراد آباد (یوپی)

نام کتاب: آئینہ شعور وآگہی

تصنیف: محمد رضا قادری۔ رابطہ نمبر 7521064491-7860704491

تبصرہ ونظر ثانی: مولانا طفیل احمد مصباحی، سابق ایڈیٹر، ماہنامہ اشرفیہ، مبارک پور

اظہار خیال: ڈاکٹر افضل مصباحی، اسسٹنٹ پروفیسر اردو، ایم ایم وی، بنارس ہندو یونیورسیٹی

کمپوزنگ: مولانا نیاز احمد مصباحی (امبیڈکر نگر)

باہتمام وتعاون: حضرت مولانا عبد الصمد امجدی، ابن مولانا عبد الحمید برکاتی (مقیم حال قطر) ساکن تاراپٹی مغربی محلہ، وارڈ نمبر ۹/، دھنوشا، نیپال

ناشر: کتب خانہ قادریہ (مبارک پور) وخانقاہ قادریہ چشتیہ راہ سلوک، مرآد آباد

تعداد صفحات: ۱۹۲

تعداد اشاعت: ۱۱۰۰

سال اشاعت: شعبان ۱۴۴۲ھ/ مارچ/ ۲۰۲۱

ملنے کے پتے

(۱) حضرت مولانا عبد الصمد امجدی، تاراپٹی، مغربی محلہ، ضلع دھنوشا

(۲) کتب خانہ قادریہ، مبارک پور، ۷۵۲۱۰۶۴۴۹۱

(۳) مجلس برکات، جامعہ اشرفیہ، مبارک پور

(۴) مرکزی، صوبائی وضلعی دفاتر، راشٹریہ علما کونسل، نیپال ۹۸۰۶۹۵۱۷۰۲

(۵) سنی پبلی کیشنز، دریا گنج، دہلی ۹۸۶۷۹۳۴۰۸۵

(۶) برکاتی منزل، حضرت مولانا محمد عیسی برکاتی۔ نزد ریلوے اسٹیشن، جنک پور، وارڈ/۱
۹۸۴۴۰۳۷۹۱۱

انتساب

علم وادب کی عظیم دانشگاہ، مادر علمی الجامعۃ الاشرفیہ، مبارک پور
کے نام
جس نے ہمیں شعور وآگہی بخشی اور پہچان عطا کی۔
قطب الارشاد، جلالۃ العلم، حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ بانی الجامعۃ الاشرفیہ، مبارک پور
کے نام
جن کی توجہات وفیوض روحانی نے ہر موڑ پر ہماری دستگیری کی۔
میرے محسن ومربی روحانی، مرشد طریقت حضرت مولانا صوفی شاہ
محمد ظہیر عالم قادری چشتی دامت برکاتہم العالیہ
کے نام
جن کی بافیض صحبتوں نے ہمیں سلوک ومعرفت اور لذت خودی سے آشنا کیا، جن کی نگہہ کیمیا اثر نے ہمارے باطنی وجود میں انقلاب برپا کر دیا۔
اور الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور کے ان اساتذہ
کے نام
جنھوں نے میری تربیت فرما کر کسی کام کے قابل بنایا۔

محمد رضا قادری
یکے از فرزندان اشرفیہ

صدقۂ جاریہ

اس کتاب کا ثواب مکرمی مولانا عبد الصمد قادری امجدی ابن مولانا
عبد الحمید برکاتی، ساکن، تاراپٹی، مغربی محلہ، وارڈ نمبر ۹
ضلع دھنوشا نیپال کے
جد گرامی مرحوم محمد ولی نور اللہ مرقدہ (متوفی: ۲۰۰۱ء)
اور جدۂ مکرمہ مرحومہ میمونہ خاتون، نور اللہ مرقدہا (متوفیہ: ۲۰۱۵ء)
کو پیش کیا جاتا ہے۔ تاکہ ابد الآباد تک اس کا ثواب ان کی روحوں کو پہنچتا
رہے۔ اور درجات بلند ہوتے رہیں۔
مولانا امجدی کی ان خدمات کو اللہ تعالی قبول فرمائے اور دارین میں بہتر جزا عطا
فرمائے۔

مشمولات

اقتصادی، کلامی اور فقہی مضامین

سائنسی مضامین

تاثراتی مضامین

کتابوں اور اداروں پر تاثرات و تقدیمات

احوال واقعی

زیر نظر کتاب ''آئینۂ شعور و آگہی'' میرے ان رشحات قلم کا مجموعہ ہے جو مختلف زمان ومکان اور مختلف ظروف واحوال میں حالات کے تقاضوں کے مطابق قلمبند کیے گئے۔ اس مجموعہ میں ۲۰۰۴ء سے ۲۰۲۱ء تک کی تحریریں شامل ہیں، چوں کہ ان تحریروں کے زمانے مختلف ہیں بایں وجہ اسلوب بیان، موضوعات اور زبان وبیان میں بھی آپ کو غیر معمولی تنوع نظر آئے گا مگر ان ساری لڑیوں کو جو چیز سِلک واحد میں پرونے کا کام کرتی ہے وہ ہے اس کی فکری اور شعوری وحدت۔ سب کا لب لباب ایک ہے۔ یہ اگرچہ ایک کتاب ہے مگر قاری کو درجنوں موضوعات سے روشناس کراتی ہے۔

اس کتاب کی تیاری میں ہم نے اپنے شعور وآگہی کا آخری قطرہ تک نچوڑ کر رکھ دیا ہے، تاکہ جو کچھ میں سوچتا ہوں، جو کچھ میرے دماغ میں ہے وہ آنے والی نسلوں تک منتقل ہو سکے۔ افکار وخیالات مرتے اس لیے ہیں کہ ہم انھیں آنے والی نسلوں تک منتقل کرنے کا کام نہیں کرتے۔ اس بے بضاعت کا خیال ہے کہ ہر ذی شعور انسان کے اندر ایک اعلی سائنسی دماغ چھپا ہوا ہوتا ہے، جسے دریافت کرکے وہ دنیا کا عظیم سائنس داں بن سکتا ہے، مگر کم ہی لوگ ایسے پیدا ہوتے ہیں جو اسے دریافت کرپاتے ہیں۔ اکثر دماغوں کا حال یہ ہے کہ وہ ماضی پر نازاں، حال پر قانع اور مستقبل سے بے پرواہ ہیں۔ ان کے پاس اپنے زمانہ والوں کو دینے کے لیے کچھ نہیں ہوتا سوائے اس کے کہ وہ ماضی کی چند افکار پریشاں کو مزین کرکے پیش کرتے رہتے ہیں۔ اعلی سائنسی دماغ نئے نئے آفاق کی تلاش کرتے ہیں، نئی نئی دریافتوں میں گم

رہتے ہیں اور انسانی ذخیرۂ معلومات میں اضافہ کرتے رہتے ہیں نہ کہ وہ مقلد محض بن کر صرف پرانی چیزوں کو منتقل کرتے ہیں۔ ایک عالم دین اپنے وقت کا عظیم سائنس داں ہوتا ہے، قرآن و حدیث سے جدید پیدا شدہ مسائل کے حل کے لیے احکام کا استخراج و استنباط یہ سائنسی عمل ہے، جس میں فقیہ اپنے دماغ کا آخری قطرہ نچوڑ کر رکھ دیتا ہے مگر کم ہی لوگ اس کا صحیح ادراک کر پاتے ہیں۔ صوفی کامل سے بڑا کوئی دانشور نہیں ہوتا، ان کی دانشوری سے قوم صدیوں کا سفر لمحوں میں طے کیا کرتی ہے۔

میں اپنی بات سمیٹتے ہوئے اب آپ کو موقع دیتا ہوں کہ براہ راست کتاب تک پہنچیں۔ یہ تحریریں عہد طالب علمی و عہد معلمی دونوں کی یادیں تازہ کرتی ہیں، اس لیے زبان و بیان کے اعتبار سے اسقام کا راہ پا جانا یقینی ہے۔ جہاں بھی ایسے مقامات آئیں انھیں ہماری ناتجربہ کاری پر محمول کرتے ہوئے ہمیں مطلع کرنے کی کوشش فرمائیں۔

میں بہت زیادہ مشکور ہوں کرم فرما، محترم، ڈاکٹر افضل مصباحی حفظہ اللہ ورعاہ، اسسٹنٹ پروفیسر اردو، ایم ایم وی، بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی کا جنھوں نے اپنی بے پناہ مصروفیات کے باوجود اس کتاب پر شاندار تبصرہ فرمایا اور اس کی افادیت میں اضافہ کیا۔ ڈاکٹر صاحب نوجوان علما کے لیے ایک قابل تقلید آئیڈیل ہیں، انھوں نے کم وقتوں میں اپنی صحافت اور اردو زبان و ادب کی خدمت کے ذریعہ پورے عہد کو متاثر کیا ہے، اور محب مکرم، فخر صحافت، حضرت مولانا طفیل احمد مصباحی حفظہ اللہ ورعاہ سابق ایڈیٹر، ماہنامہ اشرفیہ، مبارک پور کا، جنھوں نے اس کے مسودے کو

بغور پڑھا اور تصحیح فرمائی، پھر کتاب پر پانچ صفحات پر مشتمل گراں قدر تعارف و تبصرہ قلمبند فرمایا۔ مولانا سیال قلم کے مالک اور زر خیز دماغ کے حامل ہیں، نت نئے موضوعات پر ایک درجن کے قریب کتابیں لکھ چکے ہیں۔

اور شکریہ ادا کرتا ہوں محب گرامی قدر، عالم نبیل، فاضل جلیل، حضرت مولانا عبدالصمد امجدی حفظہ اللہ ورعاہ ابن مولانا عبدالحمید برکاتی صاحب، ساکن، تاراپٹی، مغربی محلہ، وارڈ نمبر ۹، ضلع دھنوشا، نیپال، مقیم حال قطر کا، جنھوں نے اس کی طباعت کا خرچ اپنے ذمہ لے کر میرے ناتواں کاندھوں کو مضبوط کیا۔ اللہ تعالی انھیں دارین کی سعادتوں سے مالامال فرمائے۔

محمد رضا قادری

خادم تدریس: جامعہ اشرفیہ، مبارک پور، اعظم گڑھ

۸ / شعبان ۱۴۴۲ھ / ۲۱ / مارچ ۲۰۲۱ء، شب دوشنبہ

''شعور وآگہی''کا''آئینہ''

نوجوان اسکالراور قلم کار محمد رضا قادری کی کتاب 'آئینۂ شعور و آگہی' کا مسودہ دیکھ کر بے پناہ مسرتوں کا احساس ہورہاہے۔حال ہی میں آپ کی کتاب 'نیپال میں اسلام کی تاریخ'نظر سے گزر چکی ہے۔ اسے دیکھ کر ہی آپ کی صلاحیتو ں کااندازہ ہوگیا تھا۔کچھ ہی دنوں بعد آپ کی تصنیف کردہ دوکتابوں کے مسودے میرے سامنے آئے...'قادری ڈائری' اور 'آئینۂ شعوروآگہی'۔مذکوہ مسودوں کوپڑھ کر راقم الحروف اس نتیجے پر پہنچاہے کہ ان دونوں کی اہمیت اپنی اپنی جگہ مسلم ہے۔دونوں کی نوعیتیں بھی جداہیں۔'آئینۂ شعوروآگہی'میں ذہن کی پختگی، تحریرکی بالیدگی، موضوعات کے انتخاب وترتیب میں 'شعوروآگہی' اور ابواب بندی میں تجربات کادخل نمایاں ہے ۔'آئینۂ شعوروآگہی'میں دعوتی،تعلیمی،سیاسی وسماجی، اعتقادی، کلامی اور فقہی موضوعات؛ تاثراتی مضامین، کتابوں، اداروں پر تبصرے اور تقدیمات وغیرہ شامل ہیں۔قلم کارنے ایک قالب میں متعدّدکتابوں کامواد بہت ہی چابکدستی سے پیش کردیاہے؛جو لائق تحسین ہے۔یوں تو'آئینۂ شعوروآگہی'کے تمام مشمولات لائق مطالعہ ہیں؛البتہ دعوتی ، تعلیمی، سیاسی وسماجی، اعتقادی اور فقہی موضوعات پر جوتحریریں شامل کی گئی ہیں وہ اہل علم کے لئے بالعموم اور علما کرام کے لئے بالخصوص اہمیت کی حامل ہیں۔اسلوب کی شگفتگی، جملوں کی ساخت اورانداز بیان کی دلکشی بوریت کاذرہ برابراحساس نہیں ہونے دیتی ہیں۔'آئینۂ شعوروآگہی' میں مختلف نوعیت کے قومی اوربین الاقوامی مسائل کوزیربحث لانااس امرکی علامت ہے کہ آپ اسلام کو اکیسویں صدی اور آنے والی ہرصدی کے لئے نمونۂ عمل بناکردنیاکے سامنے پیش کرنے کے خواہاں ہیں۔موجودہ دورمیں جس برق رفتار سے آنے والاہردن بدل رہاہے اور سائنس وٹیکنالوجی کی نت نئی ایجادات سامنے آرہی ہیں؛ان سے احترازکی بجائے استفادہ کی صورتوں پرغورکرنا ناگزیر ہے۔قول وفعل کے تضاد سے باہرنکلنا،عوام الناس کے سامنے حقیقی صورت

حال پیش کرنا، 'خذماصفاودع ماکدر' کے اصول پر عمل کرتے ہوئے ہر طرح کے شش وپنج کو دور کرنا اور تمام مسائل کا قابل عمل حل پیش کرنا وقت کا تقاضہ ہے۔ قلم کار نے 'آئینۂ شعوروآگہی' میں جرأتمندانہ قدم اٹھاتے ہوئے 'اسلام اور جدید سائنس' کے حوالے سے وافر مواد شامل کیا ہے جو اپنی مثال آپ ہے۔ اولیا کرام اور سلف صالحین کی تعلیمات کو زیر بحث لاکر من جملہ یہ پیغام دیا گیا ہے کہ ہمیں ہر حال میں اسلاف کے نقش قدم پر چل کر ہی آگے بڑھتے رہنا ہے۔

مجموعی طور پر نوجوان اسکالر، عالم دین عالی جناب محمد رضا قادری کی مذکورہ کتاب اس لائق ہے کہ ان پر مبسوط مقالہ تحریر کیا جائے لیکن سردست یہ صفحہ اس کا متحمل نہیں ہے۔ البتہ اسے پڑھ کر یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ قلم کار کی گہری نظر اسلامی تعلیمات، تاریخ، جغرافیہ، سیر، سیاست، سماجی علوم اور حالات حاضرہ پر ہے ، جن کی جھلک مذکورہ کتاب میں جابہ جا دکھائی دیتی ہے۔ اس لئے امید کی جاتی ہے کہ یہ کتاب اہل علم کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے میں کامیاب ہوگی اور مقبول خاص وعام ہو گی۔ میری خواہش ہے کہ مولانا قادری کی طرح دیگر علما کرام بھی تصنیف وتالیف کے میدان میں آگے آئیں۔ آپ کے لئے یہ میدان پوری طرح خالی ہے۔ ایک معروف انگریزی روزنامہ کے ادارتی صفحہ پر عرصۂ دراز قبل اس سرخی پر نظر پڑی تھی جو ابھی تک ذہن میں محفوظ ہے۔ میں اسے یہاں اہمیت کے پیش نظر نقل کیے دیتا ہوں:

Situation is vacant; savior is wanted.

ڈاکٹر افضل مصباحی

اسسٹنٹ پروفیسر، اردو

ایم ایم وی، بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی، اترپردیش ، بھارت

۱۵/ مارچ ۲۰۲۱

شعور وآگہی کا ایک چمکتا آئینہ

ازقلم: طفیل احمد مصباحی (سابق مدیر ماہنامہ اشرفیہ، مبارک پور)

آئینِ فطرت اور قانونِ قدرت یہی ہے کہ دنیا جب تک قائم ہے ، مسائل و مشکلات جنم لیتے رہیں گے ۔ تاریخ، عروج و زوال کی داستان دوہراتی رہے گی اور قومیں بنتی بگڑتی رہیں گی ۔ مسائل و مشکلات کا وجود میں آنا، اتنا نقصان دہ نہیں ہے ، جتنا نقصان دہ ان کا شعور و ادراک نہ ہونا ہے ۔ قوتِ فکر و عمل کا فقدان قوم کی عظمت و شوکت کے زوال کا پیش خیمہ ہے ۔ دینی، علمی، سیاسی، معاشی اور سماجی مسائل کے حل کے لیے غور و فکر، تدبر و تفکر اور شعور وآگہی ضروری ہے ۔ حلِّ مشکلات اور تصفیۂ مسائل کے علاوہ قوموں کی تعمیر و ترقی میں شعور وآگہی اہم کردار ادا کرتے ہیں ۔ راقمِ آثم نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چند روز قبل ایک شعر کہا تھا:

شعور و آگہی لازم ہے تعمیر و ترقی میں
یہ وہ جوہر ہے جس سے قوم دنیا میں پنپتی ہے

تعلیم ، سیاست ، اقتصاد و معیشت ، مادری و عالمی زبان سے واقفیت ، اعلیٰ قیادت ، محنت و مشقت اور شعور وآگہی ، یہ وہ چیزیں ہیں جو قوموں کو زمین کی پستیوں سے اٹھا کر آسمان کی بلندیوں تک پہنچا دیتی ہیں ۔ ملکی اور عالمی سطح پر آج مسلمانوں کی جو حالت ہے ، وہ اربابِ نظر سے پوشیدہ نہیں ہے ۔ تعلیمی پسماندگی ، معاشی زبوں حالی ، سیاست سے بیزاری ، اعلیٰ قیادت سے محرومی اور محنت و مشقت سے دوری نے آج قومِ مسلم کو پسماندہ اقوام کی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔

مسلمانوں کو شعور وآگہی اور تعمیر و ترقی سے ہمکنار کرنے والی کتاب " آئینۂ شعور و آگہی " کمیت و کیفیت کے لحاظ سے ایک بلند پایہ تصنیف ہے ، جو مندرجہ ذیل ابواب و موضوعات پر مشتمل ہے : دعوتی موضوعات ، تعلیمی موضوعات ، سیاسی و سماجی موضوعات ، اعتقادی ، کلامی و فقہی موضوعات ، تاثراتی مضامین ، کتابوں اور تعلیمی اداروں پر تاثرات و

تقدیمات، تعزیتی مضامین اور ہر ایک موضوع کے تحت مندرجہ ذیل عناوین پر سیر حاصل بحث گئی ہے، جس سے مصنف کی ذہنی پرواز اور فکری وسعت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے:

(۱) اکیسویں صدی میں علمائے اسلام کی تبلیغی ذمہ داریاں (۲) امریکہ کی اقتصادی پالیسی (۳) دعوتِ اسلام کے لیے موافق حالات (۴) جدید ہندوستان میں مذہبی تعلیم اور عصری علوم کی شمولیت (۵) مدارس اسلامیہ اور عہدِ حاضر (۶) قیادت کے لیے اعلیٰ بصیرت چاہیے (۷) امت مسلمہ کو ملکی اور عالمی سطح پر درپیش خطرات اور ان سے نجات کا طریقہ (۸) چھوٹی چھوٹی سیاسی پارٹیاں مسلمانوں کے لیے مفید یا مضر؟ (۹) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور طاقت کا استعمال (۱۰) مسلم معاشرے میں طلاق کے بڑھتے اثرات (۱۱) جشنِ عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم اور معمولاتِ اہلِ سنت (۱۲) ہندوازم کے بنیادی نظریات (۱۳) فقہ و قیاس کا ثبوت: قرآن وحدیث کی روشنی میں (۱۴) اسلام اور جدید میڈیکل سائنس (۱۵) اسلام، جدید سائنس کا موجد (۱۶) قرآن اور سائنس (۱۷) قرآن مجید اور جدید سائنس وغیرھم۔

یہ سارے موضوعات خالص علمی، فکری اور تحقیقی نوعیت کے ہیں، جن پر قابلِ قدر اور اطمینان بخش مواد بہت کم ملتے ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ آخر الذکر چاروں موضوعات نہایت وقیع اور فکر انگیز ہیں، جن کے مطالعے کے بعد لگتا نہیں کہ یہ کسی مدرسہ کے فارغ التحصیل مولوی کے قلم کا نتیجہ ہیں۔ فاضل مصنف اس کتاب میں عالم و مفتی کم اور ایک دیدہ ور مفکر و مدبر اور سائنسی فکر رکھنے والے اسلامی اسکالر زیادہ معلوم ہوتے ہیں۔ کتاب کا نام "آئینۂ شعور وآگہی" رکھنا، مصنف کی بلاغت آشنا فکر وطبیعت کا غماز ہے۔ کتاب اس جہت سے واقعی اسم بامسمیٰ ہے کہ اس میں مصنف نے فکر و تدبر اور شعور و آگہی کا ایک چمکتا آئینہ قارئین کے سامنے رکھ دیا ہے، جس میں وہ ماضی وحال کا عکس اور روشن مستقبل کے لیے پیش کردہ لائحۂ عمل کی تصویر دیکھتے رہیں گے۔

مؤرخ اسلام محققِ نیپال حضرت مفتی محمد رضا قادری دام ظلہ العالی (استاذ جامعہ اشرفیہ، مبارک پور، اعظم گڑھ) اپنے ہم عصر علما میں کئی حیثیتوں سے منفرد و ممتاز ہیں۔ وہ بیک

وقت، حافظ و قاری، عالم و فاضل، مفتی، محقق، ادیب اور مؤرخ اور مفسر ہیں۔ اردو کے علاوہ فارسی، عربی اور انگریزی زبان پر خاطر خواہ قدرت رکھتے ہیں۔ نادر و نایاب کتابوں کا جو ذخیرہ انہوں نے جمع کر رکھا ہے، وہ دیگر معاصر علما کے لیے لائقِ تقلید عمل ہے۔ بیشتر اوقات ذکر و اذکار اور اوراد و وظائف میں مشغول رہنے والے اس عالم و صوفی کی تصنیفی و قلمی فتوحات کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ ان کی نوکِ قلم سے مختلف موضوعات پر اب تک ڈھائی درجن کتابیں وجود میں آچکی ہیں، جن میں بعض مطبوعہ اور بعض غیر مطبوعہ ہیں۔

زیرِ نظر کتاب "آئینۂ شعور وآگہی" میں دیگر علمی و فکری موضوعات کے علاوہ سائنس کے حوالے سے بیش قیمت افادات درج ہیں، جو مصنف کی سائنسی فکر و بصیرت کو اجاگر کرتے ہیں۔ اسلام اور جدید میڈیکل سائنس، اسلام، جدید سائنس کا موجد، قرآن اور سائنس، قرآن مجید اور جدید سائنس، یہ چاروں موضوعات نہایت اہم، معلومات افزا اور لائقِ مطالعہ ہیں۔ کتاب کے جملہ مندرجات پر روشنی ڈالنا کافی مشکل اور دشوار طلب کام ہے۔ لہٰذا اختصار کے پیشِ نظر محض چند عنوانات پر مصنف کی گراں قدر تحقیقات اور فکر انگیز افادات نذرِ قارئین کرتا ہوں۔

موجودہ سائنس، فلسفۂ قدیمہ کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔ منطق کی کتابوں میں تصور و تصدیق کی دو قسمیں یعنی نظری و بدیہی بیان کی گئی ہیں۔ معلومات کو ترتیب دے کر مجہولات کو حاصل کرنے کو "نظری" کہتے ہیں اور یہی سائنس ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہہ لیں کہ تجربات و مشاہدات پر مبنی علم کو "سائنس" کہتے ہیں۔ یہاں تھیوری سے زیادہ پریکٹیکل کو اہمیت دی جاتی ہے۔ سائنس میں تجربات و مشاہدات سے حاصل شدہ معلومات کو عقلی و منطقی دلائل سے پرکھا جاتا ہے۔ سائنس داں فطرت کے نظام کو سمجھنے اور قدرت کے مخفی اسرار کو طشت از بام کرنے کی کوشش کرتا ہے اور تجرباتی علم کی روشنی میں آئے دن کوئی نیا تصور، مخصوص نظریہ اور مفروضہ پیش کرتا ہے، جس کی حیثیت بعض اوقات پیشین گوئی کی ہوا کرتی ہے۔ سائنس، نظامِ قدرت کا مطالعہ نہایت باریک بینی سے کرتی ہے۔ دور حاضر کی حیرت انگیز ایجادات

سائنسی علوم و تحقیقات کا نتیجہ ہیں۔

اسلام اور جدید میڈیکل سائنس " اس کتاب کا نہایت دلچسپ اور معلوماتی مضمون ہے، جس میں مصنف نے جدید میڈیکل سائنس کے طریقۂ علاج کو اسلام اور طبیبِ انسانیت جناب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرامین و تعلیمات کی روشنی میں تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ بخار اور آپریشن کے حوالے سے یہ اقتباس دیکھیں: " طبِ جدید جسے آج میڈیکل سائنس کے نام سے جانا جاتا ہے، اس کی رو سے بخار کے مریض کے جسم کو پہلے برف کے پانی سے بھگو دینا چاہیے اور جسم پر گیلے کپڑے کی پٹیاں رکھنی چاہیے تاکہ اس کی برودت کی وجہ سے جسم کا درجۂ حرارت کسی قدر اعتدال پر آجائے۔ اب آیئے اس باب میں رسول گرامی وقار صلی اللہ علیہ وسلم کا طبابت سے لبریز ارشاد ملاحظہ کریں: **الحُمیٰ من فیح جھنم فابردوھا بالماء** . بخار جہنم کی لپیٹ سے ہے، لہٰذا اس کو پانی سے ٹھنڈا کرو۔ (بخاری شریف، کتاب الطب، جلد دوم، ص: ۸۵۲) پانی سے بخار کا علاج آج فطری طریقۂ علاج بن چکا ہے جسے شہر و دیہات ہر جگہ اختیار کیا جا رہا ہے۔ میڈیکل سائنس کا یہ طریقۂ علاج دراصل فرمانِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے ماخوذ ہے۔ کبھی کبھی مرض کی نوعیت اس قدر مشکل ہو جاتی ہے کہ عام علاج سے افاقہ ناممکن ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں آپریشن کا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے، جسے آج جرّاحی بھی کہا جاتا ہے۔ عصرِ جدید کا انسان سمجھتا ہے کہ اس طریقۂ علاج کی دریافت ہم نے کی ہے اور صدیوں کی تحقیق کے بعد ہم نے اسے معلوم کیا ہے، اسلام کا اس میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ جب کہ سچ یہ ہے کہ اس کا موجد بھی مسلمان ہے۔ طبیبِ انسانیت حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے آپریشن کے ذریعے علاج کی بنیاد رکھی۔ حضرت سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ طبیبِ انسانیت کا معمول بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں مونڈھوں اور اخدعین (گردن کے دونوں طرف کی رگوں) کے بیچ میں تین سنگی کھنچوائے (سنن ابی داؤد، ۲، ۱۸۴) **عن ابن عباس قال: احتجم النبی صلی اللہ علیہ وسلم و ھو صائم** ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے

روزے کی حالت میں پچھنے لگوائے۔

(صحیح البخاری، جلد:۲،ص:۸۴۹)

(آئینۂ شعور وآگہی)

فاضل مصنف اپنے مضمون "قرآن اور سائنس" میں لکھتے ہیں: **و مـن یـر د ان یضلہ یجعل صدرہ ضیقا حرجا کانما یصعد فی السماء.** یعنی جب اللہ تعالیٰ کسی کوگمراہ کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اس کا دل تنگ فرما دیتا ہے، گویا وہ آسمان میں چڑھ رہا ہے۔ سائنس بھی یہی کہتی ہے کہ جب انسان آسمان کی طرف چڑھتا ہے تو اس کا دل تنگ ہوجاتا ہے ۔قرآن مجید میں ہے: **و جعلنا لکم السمع و البصر و الفؤاد**۔یہاں آیت میں پہلے سمع، پھر بصر، پھر فواد کا ذکر ہے۔ایسی ترکیب کیوں ہے ؟ تو اس کے بارے میں سائنس بھی یہی کہتی ہے کہ (انسانی تخلیق) میں پہلے کان تیار ہوتا ہے، پھر آنکھ، پھر دل۔قرآن مجید کا یہ اعجاز ہے کہ اتنی بڑی حقیقت کا انکشاف صرف ترتیب بیان کے ذریعہ کر رہا ہے، شہد کی مکھی کے تعلق سے قرآن میں ہے: **وَ اَوْ حیٰ رَبُّک اِلی النَّحل اَن اِتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَال بُیُوتاً وَ مِنَ الشَّجَرِ ومما یَعْرِشُوْنَ . ثم کُلِی مِنْ کُلّ الثَّمَرَاتِ فَاسْلُکِی سُبُل ربک ذُلَلاً.** خیال رہے کہ آیت کریمہ میں "کلی، فاسلکی" بصیغۂ تانیث خطاب ہے۔جب کہ شہد کی مکھی کے چھتوں میں مذکر بھی ہوتے ہیں۔سائنس نے بہت ہی تحقیق کے بعد بتایا کہ پورے چھتّے میں صرف ایک مذکر ہوتا ہے، بقیہ سارے مادے اور مؤنث ہوتے ہیں۔یہ وہ آیتیں ہیں جن کی تصدیق موجودہ سائنسی تحقیقات کرتی ہیں، اور یہ ساری باتیں سائنس کے وجود آنے سے ہزار سال قبل ہی قرآن میں موجود ہیں۔(زیر تبصرہ کتاب)

آج مسلمانوں کے ہمہ جہت تنزل و انحطاط کی ایک بڑی وجہ ان کا اعلیٰ قیادت سے محروم ہونا بھی ہے۔ مصنف نے مسلم قیادت اور قائدین کے اوصاف کے حوالے سے بڑی فکر انگیز گفتگو فرمائی ہے۔ایسی پُر مغز اور معنیٰ خیز تحریر بار بار پڑھنی چاہیے اور اس کے مندرجات پر عمل کرنے کی حتی الوسع کوشش کرنی چاہیے۔یہ اقتباس ملاحظہ کریں :

قیادت کیا ہے؟ قیادت، نفسِ واقعہ کے اعتبار سے اپنے آپ میں ایک غیر معمولی عمل ہے۔ قیادت، انتہائی مخلصانہ جدو جہد کا نام ہے، جس کے لیے قائد کو آخری حد تک بے لوث ہونے کی ضرورت ہے۔ قیادت سے قوموں کی تقدیریں بنتی اور بگڑتی ہیں۔ قائد اپنی قوم کا نمائندہ اور اس کا معمار ہوتا ہے۔ قائد کے ایک صحیح اقدام سے کبھی قوم کی تقدیر جاگ اٹھتی ہے اور کبھی اس کی معمولی سی لغزش پوری سوسائٹی کے لیے ناکامی کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔ قائد دور اندیش ہوتا ہے۔ وہ آج کو نہیں بلکہ آج سے پچاس سو سال آگے تک دیکھتا ہے۔ عام حالتوں میں انسان صرف دو آنکھوں کا استعمال کرتا ہے، لیکن قائد کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ دو باطنی آنکھیں (دل و دماغ) جو اللہ تعالیٰ نے اسے بصیرت کے لیے اضافی طور پر عطا فرمائی ہیں، ان کا بھی استعمال کرے۔ قائد اپنی قوم کا سفیر ہوتا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ آنکھ والا ہو۔ حالات پر اس کی گہری نظر ہو۔ وہ اپنے گردو پیش کے بارے میں اتنا حساس ہو کہ سمندر پر دکھائی جانے والی لکیروں سے کسی خاموش طوفانِ بلا خیز کی آمد کا اندازہ کر سکے۔ قیادت کے لیے غیر معمولی دانش مندی، غایت درجہ تدبر اور جرات و بسالت کی ضرورت ہوتی ہے۔ جہاں قائد کے لیے ضروری ہے کہ وہ مضبوط قوتِ ارادی کا مالک ہو، اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ایک اچھا سائیکولوجسٹ (Psychologist) ماہرِ نفسیات ہو، تاکہ وہ لوگوں کے عمل اور ردِ عمل کے اسباب سے بروقت خبر دار ہو سکے۔ (آئینۂ شعور وآگہی)

مدارسِ اسلامیہ میں عصری علوم کی شمولیت " کے عنوان سے جو مضمون زینتِ کتاب ہے، وہ اختصار و جامعیت کے ساتھ افادیت و معنویت کا خوب صورت نمونہ ہے۔ اس کی سطر سطر سے مصنف کی تعلیمی مہارت کا اندازہ ہوتا ہے۔ فاضل مصنف کی پیش کردہ یہ تجویز اہلِ مدارس کو دعوتِ فکر و عمل دیتی ہے : مدارسِ اسلامیہ میں عصری علوم کا انضمام (شمولیت) اس طرح ہونا چاہیے کہ یہ دینی علوم کی ضرورت بن کر دینی مضامین کے نصاب میں جذب ہو جائیں۔ خاص بات یہ کہ دونوں مضامین کے درمیان جو گہرا تعلق اور معنوی رشتہ قائم ہے، اسے بھی صراحت کے ساتھ بیان کیا جائے۔ علمِ ریاضی، درجۂ اعدادیہ سے درجۂ رابعہ تک

شاملِ نصاب ہونا چاہیے۔ درجۂ اعدادیہ سے درجۂ اولیٰ تک ہندی زبان اور درجۂ اولیٰ سے فضیلت تک انگریزی زبان شاملِ نصاب ہو۔ درجۂ اعدادیہ سے درجۂ رابعہ تک سائنس و جغرافیہ اور درجۂ رابعہ سے درجۂ سادسہ تک علم ہیئت، توقیت اور فلکیات کو شاملِ نصاب رکھا جائے۔ ان عصری علوم کی تدریس باضابطہ لیب کی مدد سے ہونی چاہیے۔ ان کے تین یونٹ بنائے جائیں۔ ان تینوں علوم کو پڑھانے کے لیے جدید طرز پر لکھی جانے والی کتابوں سے مدد لی جائے اور تدریس میں قوتِ سمعیہ وبصریہ دونوں کا استعمال یکساں طور پر کیا جائے"۔

فنی و اصطلاحی اعتبار سے جسے "افادی ادب" کہتے ہیں، مولانا موصوف کی یہ کتاب اس میزان پر کھری اترتی ہے۔ کتاب میں شامل اکثر مضامین اسلامی اور افادی ادب کے حامل ہیں۔ اختر انصاری "افادی ادب" کے حوالے سے لکھتے ہیں: "ادب زندگی کی تفسیر بھی ہے اور تنقید بھی۔ وہ زندگی کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ زندگی کی تخلیق بھی کرتا ہے۔ وہ اپنے زمانے کے سماجی، سیاسی اور معاشی ماحول کی صرف عکاسی ہی نہیں کرتا بلکہ اس میں رنگ بھی بھرتا ہے۔ مختصر یہ کہ وہ زندگی سے اثرپذیر بھی ہوتا ہے اور زندگی پر اثرانداز بھی"۔

صاحبِ کتاب نے جابجا زندگی برائے بندگی کا فارمولہ پیش کیا ہے اور ادب برائے زندگی کی ترجمانی کرتے ہوئے دینی، ملی، علمی، سیاسی، معاشی اور تمدنی احوال کا جائزہ مفکرانہ انداز میں لیا ہے۔ فاضل مصنف کا ایک زمانہ نئی دہلی جیسے علمی، ادبی اور ثقافتی شہر میں گذرا ہے، جہاں انہیں بڑے بڑے مفکرین اور مدبرین کے خیالات وتجربات سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملا ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کے افکار میں بلندی اور خیالات میں وسعت ہے ۰۰ء سے ۰ء تک کے مابین تحریر کیے گئے اس مجموعۂ مضامین و مقالات میں انہوں نے مختلف مسائل و موضوعات پر جس بالغ نظری کے ساتھ اظہارِ خیال کیا ہے، وہ حددرجہ وقیع اور قابلِ فکر وعمل ہیں۔ خلاصۂ کلام یہ کہ کتاب مجموعی اعتبار سے ایک بیش بہا علمی وفکری مرقع ہے۔ اس کے وقیع مندرجات کے پیش نظر راقم سطور امید کرتا ہے کہ مصنف کے پیش کردہ افکارِ عالیہ قارئین کی معلومات میں اضافہ کرنے کے علاوہ ان کے ذہن وفکر کے بند دریچوں کو کھولنے میں معاون ثابت ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ صاحبِ کتاب کے علم وعمل اور عمر واقبال میں برکتیں عطا فرمائے آمین۔

دعوتی مضامین

اکیسویں صدی میں یورپ وامریکہ اسلام کی دہلیز پر

مفتی محمد رضا قادری مصباحی

مغرب کے عظیم مفکر مشہور ڈرامہ نویس جارج برناڈ شا (۱۸۵۶-۱۹۵۰) نے کہا تھا اگر کوئی مذہب ہے جو اگلے سو سال میں انگلستان پر حکومت کرے، نہیں بلکہ سارے یورپ پر حکومت کرے تو وہ صرف اسلام ہوگا۔ میں نے محمد کے مذہب کو ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے؛ کیوں کہ اس کے اندر حیرت انگیز طاقت ہے۔ یہ واحد مذہب ہے جس کے متعلق میرا خیال ہے کہ اس کے اندر بدلتی ہوئی دنیا کو اپنے اندر جذب کرنے کی صلاحیت ہے، جس کے اندر ہر دور کے لیے اپیل ہے:

If any religion has the chance of ruling over England, nay Europe, within the next hundred years, it can only be Islam. I have always held the religion of Muhammad in high estimation because of this wonderful vitality. It is the only religion wich appears to me to possess the assimilating capability to the changing face of existence which can make its appeal to every age.(احیاے اسلام)

مغربی مفکر نے اسلام کے حوالے سے جو بات آج سے ۷۰ رسال قبل کہی تھی اس کا عملی ظہور اکیسویں صدی کے آغاز سے ہی ہو چکا ہے۔ ۱۰۹۶ء سے تیرہویں صدی عیسوی کے آخر تک مکمل دو سو سال یورپ نے اسلام کے خلاف صلیبی جنگ کی، جس میں انھیں شکست فاش ہوئی اور انھیں جلد ہی یہ احساس ہو گیا کہ عسکری میدان میں ہم مسلمانوں کو مات نہیں دے سکتے؛ کیوں کہ علم، سائنس و ٹکنالوجی میں وہ ہم سے بدرجہا بڑھے ہوئے ہیں۔ ہمارے پاس پرانے قسم کے جنگی اسلحے ہیں اور مسلمانوں کے پاس جدید جنگی ہتھیار ہیں۔ اس احساس کے تحت انھوں نے میدان جنگ بدلنے کا فیصلہ کیا۔ وہ فیصلہ یہ تھا کہ یورپ مسلمانوں کے علم و ہنر

اور سائنس و ٹکنالوجی کو سیکھ کر مسلمانوں کو اس میدان میں شکست دے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے انھوں نے اسلامی علوم کے اعلیٰ مراکز غرناطہ، اشبیلیہ، طُلَیطلہ اور سسلی (صقلیہ) وغیرہ کا رخ کیا اور وہاں بڑی محنت سے مسلمانوں کے علوم مثلاً عربی، ریاضی، طب، فلکیات، نجوم، فلسفہ اور سائنس و ٹکنالوجی کی اعلی تعلیم حاصل کی۔ یہی وہ فیصلہ تھا جو سولھویں صدی کے اس عظیم واقعہ کا سبب بنا جس کو دنیا یورپ کی نشاۃ ثانیہ (Renaissance) کے نام سے جانتی ہے۔

مسلمانوں کے علوم سیکھ کر بالآخر یورپ نے اتنی ترقی کرلی کہ چار سو سال کی جد و جہد کے بعد انڈسٹریل عہد میں اپنے کو داخل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اب چار سو سال کے بعد یہی صورت حال برعکس شکل میں مسلمانوں کے سامنے تھی انھوں نے دیکھا کہ مغرب علوم وفنون اور سائنس کے میدان میں آگے بڑھ چکا ہے تو ان کے اندر مغربی علوم ان کی تہذیب و زبان حاصل کرنے کا رجحان پیدا ہوا لیکن مسلمانوں کے حق میں وہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا جو یورپ کے حق میں ہوا تھا۔ ایک ہی نوع کے دو واقعوں میں انجام کا یہ فرق کیوں ہوا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ نتیجہ کا یہ فرق دونوں کی ذہنیت میں فرق کے سبب ہوا۔ مغرب نے ہمارے علوم اس جذبہ کے تحت سیکھے کہ وہ ہمیں ان میدانوں میں شکست دے سکیں اور ہم آج ان کے علوم اس لیے سیکھ رہے ہیں کہ ہم ان کی نظر میں معزز بن جائیں اور مغرب کی نقالی کرنے لگیں، جہاں ذہنیت میں یہ فرق پایا جائے وہاں نتیجہ میں فرق پایا جانا لازمی امر ہے۔

اب اگر مسلمان اس میدان میں منظّم کوشش کرتا بھی ہے اور سو سال کی محنت کے بعد انڈسٹریل دور میں داخل ہونے میں کامیاب ہو بھی گیا تو مغرب نہ جانے کس سپر انڈسٹریل دور سے گزر رہا ہوگا لہذا سائنسی وصنعتی راہ سے یورپ کو فتح کرنا مسلمانوں کے لیے بے حد مشکل امر ہے لہذا ہمیں بھی میدانِ جنگ تبدیل کرتے ہوئے اب کوئی دوسری راہ تلاش کرلینی چاہیے۔

یورپ وامریکہ کی تسخیر کی راہ:

مسلمان اپنے داخلی و خارجی انتشار اور مسائل کے سبب گزشتہ کئی صدیوں سے اس

پوزیشن میں نہیں ہے کہ مادی وعلمی اعتبار سے ترقی یافتہ قوموں کو شکست دے سکے۔ اب اس کے لیے فتح یابی کا صرف ایک باب کھلا رہ گیا ہے اور وہ دعوت کا راستہ ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ علمی و سائنسی میدان میں وہ پیش رفت نہ کریں بلکہ اس میدان میں مؤثر پیش قدمی کرتے ہوئے ہم دعوت کا راستہ اختیار کریں۔ ہم ان قوموں کو اپنا مدعو سمجھیں اور ان کے اندر دعوتی کوششیں تیز کردیں۔ قوم مسلم مادی وسائنسی اعتبار سے اگرچہ کمزور ہے لیکن نظریاتی قوت کے اعتبار سے ابھی بھی دنیا کی سب سے طاقتور ترین قوم ہے۔ تاریخِ اسلام میں بارہا ایسا ہوا کہ فاتح قوموں نے مسلم ممالک کی اینٹ سے اینٹ بجادی، ان کے تمام تمدنی نشانات مٹاڈالے، لیکن کچھ ہی عرصہ بعد دعوتی کوششوں کے نتیجے میں اس نے مفتوح قوم کے مذہب کو قبول کرلیا۔ اس کی واضح مثال سلجوقیوں، تاتاریوں، مغلوں اور ترکوں کا بکثرت اسلام میں داخل ہونا ہے۔ یہ وہ قومیں ہیں جنھوں نے اپنی وحشیانہ کارروائی سے پورے وسطی ایشیا کو تہ وبالا کردیا تھا جہاں بھی اسلامی تمدن اور تاریخ کے نشانات تھے سب مٹادیے۔ جب مسلمان قید ہوکر ان کے یہاں پہنچے اور انھیں قریب سے مسلمانوں کی زندگی دیکھنے کا موقع ملا تب انھیں اسلام کی حقیقت سمجھ میں آئی اور کلمہ پڑھ کر دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے اور ۶۰۰؍سال تک مسیحی طاقتوں کے مقابلے میں سیسہ پلائی ہوئی آہنی دیوار بنے رہے۔ اکیسویں صدی میں مسلمان ایک بار پھر دور مغلوبی سے گزر رہے ہیں ان کے تاریخی و تہذیبی نشانات کو مٹایا جارہا ہے۔ یورپ وامریکہ کے وحشی تاتاری ایک بار پھر مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹادینا چاہتے ہیں، لیکن قدرت الٰہیہ نے ان کے لیے جو انجام مقدر کردیا ہے وہ یہ کہ یورپ وامریکہ کے وحشی تاتاری ایک بار پھر مفتوح قوم کے مذہب کو قبول کرلیں۔

پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے:

یہ قانونِ فطرت ہے کہ جب کسی سے انتقام لینے کے بعد انتقام کی آگ ٹھنڈی ہوجاتی ہے تووہ اپنی اصل کی طرف لوٹتا ہے اپنے کیے ہوئے پر نادم ہوتا ہے؛ اس لیے کہ اس دنیا میں ہر بلندی کے لیے پستی اور ہر کمال کے لیے زوال مقدر ہے سوائے ان نفوس کے جن کو اللہ

نے ہمیشہ کے لیے بلند کیا۔

تاتاری قوم ساتویں صدی ہجری کے اوائل میں منگولیا (چین) سے ظاہر ہوئی فطری طور پر بڑی بہادر اور جنگ جو قوم تھی بدوی قبائل پر مشتمل یہ جنگجو قوم جس متمدن خطے سے گزر جاتی اسے ویران کر چھوڑتی میدان جنگ میں جب پیاس لگتی تو گھوڑے کی پشت پر خنجر مار کر خون چوس کر پیاس بجھالیتی، اس نے شاہ خوارزم کی ایک غلطی پر خوارزم سمیت عراق، سمرقند و بخاری، ماوراء النہر سے لے کر مشرقی ہند تک کے سرحدی علاقوں کو تاخت و تاراج کردیا۔ ۲۰؍لاکھ سے زائد مسلمان صرف عراق میں قتل کیے گئے۔ ان کے سروں سے مینار یں تعمیر کی گئیں۔ جب ان کے انتقام کی آگ ٹھنڈی ہوئی تو انھیں ہوش آیا، ہلاکو خان کا پوتا بڑکہ خان اسلام کی تعلیمات سے متاثر ہوکر اپنی پوری قوم کے ساتھ مشرف باسلام ہوگیا۔ یہی صورت حال جزوی طور پر اکیسویں صدی میں سوئٹزرلینڈ کی سوئس پیپلز پارٹی سے تعلق رکھنے والے معروف سیاست داں ''ڈینیل اسٹیچ'' (Danielsteich) پر صادق آتی ہے۔ اس نے سوئٹزرلینڈ میں مسجدوں کے میناروں پر پابندی لگانے کی آواز بلند کی تھی، پورے ملک میں مسلم مخالف شدت پسندی کے جذبات ابھارنے میں اس نے نمایاں کردار ادا کیا تھا۔

مشہور عربی انگلش چینل ''الجزیرہ'' کی طرف سے فروری ۲۰۱۰ء میں پیش کردہ رپورٹ کے مطابق اس کا ایمان بیدار ہوگیا اور اس نے اسلام قبول کرلیا۔ بلا آمیز قرآنِ کریم کا تجزیاتی مطالعہ اس کے قبول اسلام کا سبب بن گیا۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ قرآنِ کریم کا مطالعہ اس نیت سے کرے گا کہ میناروں کے خلاف چلائی جانے والی مہم کی حمایت میں وہ قرآن سے دلائل حاصل کرے گا اور قرآنی تعلیم کی روشنی میں اپنے اسلام مخالف موقف کو مضبوط ثابت کرنے کے لیے مسلمانوں سے مباحثہ کرے گا۔ جب اس نے اس مقصد کے لیے نور ہدایت کا مطالعہ کرنا شروع کیا تو اپنی نیت کے برعکس وہ قرآنی آیات کا قائل ہوتا چلا گیا اور اسلام اس کی روح میں اترتا چلا گیا الجزیرہ کی رپورٹ کے مطابق اسلام قبول کرنے کے بعد اس عیسائی سیاست داں نے کہا: اسلام نے مجھے زندگی کے کئی اہم معاملات میں مثبت جواب دیا ہے، ان

سوالات کے تشفی بخش جوابات میں نے عیسائیت میں نہیں حاصل کیے۔ سابق ڈینیل اسٹیچ اس وقت ایک راسخ العقیدہ مسلمان اور پنج وقتہ نمازی ہے آج وہ خود میناروں پر پابندی کی شدت سے مخالفت کر رہا ہے اور یورپ کی سب سے خوبصورت مسجد تعمیر کرنے کا منصوبہ بنا رہا ہے جو کہ سوئٹزر لینڈ کی پانچویں مسجد ہوگی۔ (ماخوذ، از ماہنامہ گلستان رضا، کلکتہ، ج:۱، شمارہ:۱، اکتوبر ۲۰۱۰ء)

اسلام دشمن فلم ساز کا قبول اسلام :

اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف ''فتنہ'' نامی فلم بناکر پوری دنیا میں شہرت حاصل کرنے والے ہالینڈ کے فلم ساز اور ممبر پارلیمنٹ ارناوڈ وین ڈورن (Arnoud van Doorn) ان دنوں قبول اسلام کے سبب موضوعِ بحث بنے ہوئے ہیں ان کی بنائی ہوئی فلم ''فتنہ'' کے سبب ساری دنیا میں اسلام کے خلاف فتنہ اٹھ کھڑا ہوا تھا اور پوری دنیا کے اندر مسلمانوں نے اس کے خلاف احتجاج کیے مگر آج اسلام نے اس کے دل کی دنیا میں انقلاب برپا کر دیا ہے، کفر و شرک کی ظلمت کو مٹا دیا ہے اور آج وہ امت مسلمہ کا حصہ بن چکے ہیں۔

ڈورن کا شمار اسلام کے سخت مخالفین میں ہوتا تھا، ان کا تعلق ہالینڈ کی اسلام دشمن سیاسی جماعت ''فریڈم پارٹی'' سے تھا یہ پارٹی عموماً ہالینڈ میں مسجدوں کی تعمیر اور اسلامی شعائر کی مخالفت کرتی ہے اس پارٹی کے کچھ ممبران نے مل کر ڈورن کے ساتھ ''فتنہ'' فلم تیار کی تھی مگر ان کے قبول اسلام نے سب کو حیرت میں ڈال دیا جب انھوں نے اپنے اسلام قبول کر لینے کے متعلق ٹویٹر پر لکھا تو لوگوں نے اسے مذاق سمجھتے ہوئے مزاحیہ تبصرے کیے لیکن رفتہ رفتہ حقیقت کھلتی گئی۔ ڈورن نے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ میں نے اسلام کیوں قبول کیا کہا کہ: میں اسلام کے تعلق سے غلط فہمی کا شکار تھا۔ میں اسلام کی تعلیمات کو مغربی پروپیگنڈہ کی نظر سے دیکھتا تھا، لہٰذا مجھے اسلام سے نفرت تھی اور اس لیے فتنہ فلم بنائی اس کے بعد میں نے اسلام کا مطالعہ شروع کیا؛ کیوں کہ میرے اندر حقیقت جاننے کی چاہت تھی، میں نے قرآن اور پیغمبر اسلام کی سیرت کا مطالعہ کیا، شریعت اسلامیہ مطالعہ میں رہی تقریباً ایک سال

کی تحقیق کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ میں نے اسلام کے تعلق سے جو نظریہ قائم کر رکھا ہے وہ غلط ہے حقیقت یہ ہے کہ اسلام امن اور آشتی کا مذہب ہے جب سچائی میرے سامنے آگئی تو پھر اسلام قبول کرنے کے سوا کوئی راستہ نہ تھا۔ آئندہ ان کا پروگرام ہے کہ اب وہ اپنی زندگی کو اسلام کی اشاعت کے لیے وقف کر دیں گے۔ اب ان کا ارادہ اسلام اور پیغمبر اسلام کی زندگی پر ایک فلم بنانے کا ہے جس کے ذریعہ وہ فتنہ فلم کا کفارہ ادا کرنا چاہتے ہیں گزشتہ دنوں انھوں نے مکہ معظّمہ اور مدینہ طیبہ کا سفر کیا، عمرہ کیا اور پوری دنیا کے مسلمانوں کے لیے دعا مانگی۔ (ماخوذ: نئی دنیا دہلی ر ۲۰ تا ۲۶ ر مئی ۲۰۱۳ء)

جینٹ جیکسن کا قبول اسلام اور مغرب میں اضطراب:

دنیا کی مشہور عورتوں میں سے ایک، دنیا کی سب سے خوبصورت خواتین میں سے ایک، دنیا کی بہترین گلوکارہ، مائیکل جیکسن کی بہن جینٹ جیکسن، جس پر پورا امریکہ اور پورا یورپ فدا تھا، جس کے حسن کا جادو انسان کے سر چڑھ کر بولتا تھا جس کے گانوں کے سروں پر لوگ مدہوش ہوجاتے تھے، آج انھیں گانا گانے والے لبوں پر فقط ایک ہی نام ہے اللہ اللہ اللہ''

۱۶ ر مئی ۱۹۶۶ء میں گیری انڈیانا میں پیدا ہونے والی اپنے بھائی بہنوں میں سب سے چھوٹی جینٹ نے نہ صرف بے شرمی سے مکمل کنارہ کشی کرلی ہے بلکہ برقع بھی اوڑھ لیا ہے اور اپنے گناہوں سے توبہ کرکے اسلام کے آغوش میں آگئی ہے۔

گزشتہ برس جینٹ نے ایک نجی تقریب میں اپنے امیر کبیر بوائے فرینڈ ''وصام المنا'' سے نکاح کرنے سے قبل ہی اسلام قبول کرلیا تھا، جینٹ کے قبول اسلام کا سبب بھلے ہی ان کے شوہر بتائے جارہے ہوں مگر حقیقت یہ ہے کہ اس نے دل سے اسلام قبول کیا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ برقع نہ اوڑھتی اور نہ ہی انٹر ٹینمنٹ بزنس کو الوداع کہتی۔ وصام المنا دوحہ قطر کے رہنے والے ایک خوبصورت اور سنجیدہ فکر انسان ہیں ان کی بزنس پوری دنیا میں المنا ریٹل گروپ کے نام سے پھیلی ہوئی ہے۔ تین ملکوں میں ان کے درجنوں محل نما گھر ہیں اس بات کے پیش نظر مغربی میڈیا یہ ڈھول پیٹ رہا ہے کہ جینٹ نے المنا سے نہیں اس کی دولت سے

شادی کی ہے مگر یہ صرف الزام تراشی ہے۔ جینٹ جیکسن جیسی دولتمند خاتون کے لیے بعید ہے کہ وہ کسی دولت کی لالچ میں المنا سے نکاح کرے۔

جینٹ اسلام قبول کرکے خوش ہے۔ مطمئن ہے۔ اگر کوئی مضطرب ہے تو مغرب اور مغربی میڈیا۔ انھیں سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ آخر ہماری خواتین کیوں جوق در جوق اسلام میں داخل ہو رہی ہیں خاص طور پر مشہور و مقبول خواتین۔ مغرب یہ سوچنے پر مجبور ہے کہ آخر اسلام میں ایسا کیا ہے کہ ان کی عورتیں سب کچھ چھوڑ کر مسلمان ہو رہی ہیں برقع اور عبا جس کو وہ غلامی کا طوق کہتے ہیں وہ طوق پہن کر عورتیں بے حد مطمئن اور خوش نظر آرہی ہیں اتنی کہ جتنی وہ پہلے کبھی نظر نہیں آئیں۔ (ماخوذ، از نئی دنیا ۲۰ تا ۲۶ر مئی ۲۰۱۳ء)

ٹونی بلیر کی سالی لون بورتھ کا قبولِ اسلام :

۲۶ر اکتوبر ۲۰۱۰ء کو روزنامہ راشٹریہ سہارا دہلی نے اس خبر کو شائع کیا کہ سابق برطانوی وزیر اعظم ٹونی بلیر کی نسبتی بہن (سالی) لون بورتھ مشرف باسلام ہوگئیں۔ لون بورتھ پیدائشی طرپر کیتھولک عیسائی ہیں۔ انسانی حقوق کی علمبردار صحافی ہیں اور ایران کے انگریزی نیوز چینل پریس ٹی وی کے لیے کام کرتی ہیں ان کے اسلام قبول کرنے کی خبر اس وقت سامنے آئی جب وہ عالمی امن اور اتحاد ۲۰۱۰ء کے پرچم تلے ایک ریلی میں شرکت کر رہی تھیں ان کے قبول اسلام کا سبب اسلام کا روحانی نظام بنا۔ ان کا کہنا ہے کہ چھ ہفتہ قبل مجھے ایران کی درگاہ میں جانے کا موقع ملا جہاں مجھے بہت مؤثر تجربہ ہوا اور میرا دل اسلام کی طرف پھر گیا۔ اب میں پانچوں وقت نماز پڑھتی ہوں، وقتاً فوقتاً مسجد بھی جاتی ہوں، مزید یہ کہ ڈیڑھ مہینہ سے میں نے شراب نہیں پی ہے۔ محترمہ بورتھ اب اپنا سر ڈھانپتی ہیں اور حجاب لگاکر باہر نکلتی ہیں ان کا کہنا ہے کہ مستقبل میں میں برقع بھی پہن سکتی ہوں۔ انھوں نے مزید کہا ممکن ہے کہ میرے اسلام قبول کرنے سے تنازع پیدا ہو لیکن اسے کیا کہیے کہ ہر عمل کا ایک ردعمل ہوتا ہے۔

برطانیہ میں مذہب تبدیل کرکے مسلمان بننے والوں کی تعداد ایک لاکھ کے قریب:

روزنامہ راشٹریہ سہارا نئی دہلی، ۵؍جنوری ۲۰۱۱ء میں پی ٹی آئی لندن کے حوالے سے ایک اہم معلوماتی تحریر شائع کی گئی ہے۔ اس کا عنوان ہے **”ہر سال تقریباً ۵؍ہزار برطانوی باشندے مسلمان بن رہے ہیں“** مختلف مذاہب کے بارے میں ریسرچ کرنے والے ایک تھنک ٹینک نے اپنے ایک تفصیلی مطالعہ میں کہا ہے کہ برطانیہ میں گزشتہ دہائی کے دوران مذہب تبدیل کرکے مسلمان بننے والے برطانوی شہریوں کی تعداد میں کافی اضافہ ہوا ہے۔ ”فیتھ میٹرس“ نام کے ایک تھنک ٹینک نے تبدیل مذہب کرکے مسلمان بننے والے برطانوی شہریوں کے بارے میں کہا ہے کہ ایسے لوگوں کی تعداد ایک لاکھ تک ہوسکتی ہے اور ہر سال تقریباً ۵؍ہزار لوگ مسلمان بن رہے ہیں حالاں کہ اس مطالعہ سے پہلے تبدیل مذہب کرنے والے لوگوں کی تعداد ۱۴؍ہزار سے ۲۵؍ہزار کے درمیان بتائی گئی ہے۔ مذہب تبدیل کرنے والوں کی یہ تعداد ظاہر کرتی ہے کہ امریکہ میں ۱۱؍ستمبر ۲۰۰۱ء اور لندن میں ۷؍جولائی کو ہونے والے حملوں کا تبدیلی مذہب پر کوئی منفی اثر نہیں پڑا ہے بلکہ ان حملوں کے سبب اسلام کی طرف لوگوں کے رجحان میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔

۲۰۰۱ء سے ۲۰۱۰ء تک ۵۰؍ہزار خواتین مشرف باسلام:

جہاں بلجیم اور فرانس جیسے ممالک، مسلم خواتین کا تشخص مٹانے میں لگے ہوئے ہیں اور برقع پر پابندی عائد کرکے خوش ہیں وہیں ان دنوں برطانیہ اور مغربی ممالک میں خواتین کے قبول اسلام کا رجحان بڑھتا جارہا ہے۔

اس تبدیلیٔ مذہب کی خاص وجہ معاشرے میں خواتین کی روز بروز بڑھتی ناقدری اور انھیں متاع کوچہ وبازار سمجھنے کی ذہنیت بتائی جارہی ہے۔ برطانوی خبر رساں ایجنسی کے مطابق برطانیہ کے اندر اس رجحان میں کافی تیزی آئی ہے اور ۲۰۰۱ء میں ہوئی مردم شماری کے مطابق اسلام قبول کرنے والی برطانوی خواتین کی تعداد ۳۰؍ہزار سے تجاوز کرچکی ہے اور اب یہ تعداد پچاس ہزار سے بھی آگے بڑھ چکی ہے۔ برطانیہ کا کہنا ہے کہ اس وقت چرچ کی ہفتہ وار مذہبی تقریب میں شرکت کرنے والی خواتین کی تعداد کم ہوکر ۲؍فیصد رہ گئی ہے اس کے برعکس

سینٹرل لندن کی ریجنٹ پارک مسجد میں نماز کے لیے شریک ہونے والوں کی دو تہائی تعداد مسلم خواتین کی ہوتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ برطانوی خواتین بے حیائی کی زندگی پر باحجاب زندگی کو ترجیح دے رہی ہیں۔ حالیہ دنوں میں اسلام قبول کرنے والی ۵؍ برطانوی خواتین میں سے ایک ’’عقیلہ لنڈسے‘‘ نے کہا کہ اسلام میں آنے سے قبل مجھے لگتا تھا کہ مذہب ایک فرسودہ نظریہ ہے لیکن اب مجھے لگتا ہے کہ زندگی صرف ایک بار ملتی ہے اور اس کو بامقصد طور سے جینا چاہیے۔ دوسری مسلم خاتون ’’کیتھرین ہسلٹن‘‘ نے کہا کہ ابتدائی دنوں میں قرآن نے میری فہم و دانش کو متاثر کیا، اس کے بعد میرے اور قرآن کے درمیان روحانی رشتہ قائم ہو گیا۔ میں یہ پڑھ کر حیران تھی کہ ۱۴۰۰؍ سال قبل قرآن نے عورت کو کیسے اہم حقوق دیے ہیں ۔ سکینہ ڈگلس نام کی ایک افریقی نژاد برطانوی خاتون کا بیان ہے کہ جب قرآن پڑھنے کے بعد میں نے پردہ کرنا شروع کر دیا تو مجھے بے انتہا مسرت ہوئی اور مجھے پہلی بار لگا کہ میں مردوں کی ہوسناک نگاہوں کے سامنے سجا ہوا دسترخوان نہیں ہوں، بلکہ ایک باعزت خاتون ہوں۔

(ماخوذ از روزنامہ راشٹریہ سہارا نئی دہلی ؍ ۵؍ جون ۲۰۱۰ء)

نائن الیون کے بعد امریکہ میں مطالعۂ اسلام کی لہر:

۱۱؍ ستمبر ۲۰۰۱ء کے حادثہ کے بعد امریکہ میں غور و فکر کا ایک نیا رجحان پیدا ہوا ہے۔ ہر کوئی اسلامی کتابوں، جرائد و مجلّات، اسلام اور پیغمبر اسلام پر لکھی جانے والی کتابوں میں دلچسپی لے رہا ہے۔ ان میں جو کتاب سب سے زیادہ توجہ اور دلچسپی کا مرکز بنی ہے وہ قرآن ہے۔ نیویارک، واشنگٹن، شکاگو اور نیوجرسی سے لاس اینجلس تک جن کتب خانوں پر قرآن شریف کے نسخے پچھلے کئی سالوں سے فروخت نہیں ہوئے تھے وہ بہت جلد فروخت ہو گئے اور انھیں قرآن کے نئے ایڈیشن شائع کرنے پڑے اور دیکھتے ہی دیکھتے قرآن امریکہ میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب بن گیا۔ دراصل اس کے پیچھے یہ ذہنیت کارفرما ہے کہ آخر قرآن میں ایسی کیا بات ہے کہ جس کو پڑھنے کے بعد انسان دہشت گرد بن جاتا ہے، وہ جہاد کے نام پر انتہا پسندی کی حدوں کو پار کر جاتا ہے۔ آخر اسلام میں ایسی کون سی تعلیم دی گئی ہے جو انسان کو

ایسے دہشت گردانہ اعمال کے ارتکاب پر آمادہ کرتی ہے۔ جب اس ارادہ سے وہ قرآن کا مطالعہ کرتے ہیں اور قرآن میں ان کا مطلوب ملتا نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس اس کا سابقہ اس قسم کی آیتوں سے پڑتا ہے مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْفَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا وَ مَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَا اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا۔ جس نے کوئی جان قتل کی بغیر جان کے بدلے یا زمین میں فساد کیے تو گویا اس نے سب لوگوں کو قتل کیا اور جس نے ایک جان کو جِلایا اس نے گویا سب لوگوں کو جلا لیا۔ (المائدہ، آیت: ۳۰) تو اسلام کی جاں بخش تعلیم کا اسیر بن جاتا ہے۔ قرآن اس کے فکر و شعور کو جھنجھوڑتا ہوا نظر آتا ہے۔ معروف پبلیشر "Penguin Book" نے ۱۱ر ستمبر کے واقعہ کے بعد قرآن کریم کے ۲۰ر ہزار سے زائد نسخے تقسیم کیے۔ (امریکی اخبار یو ایس اے ٹوڈے USA Today) نے لکھا تھا: لوگ اسلام کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں اور اس رجحان نے امریکہ میں قرآن کو سب سے زیادہ فروخت ہونے والی کتاب بنادیا ہے؛ کیوں کہ امریکہ کے غیر مسلموں نے محسوس کیا ہے کہ ایک مسلمان یا کوئی اور شخص اس کتاب کا کوئی بھی صفحہ کھول کر اس سے زندگی کا کوئی نہ کوئی راز جان سکتا ہے۔ یہاں تک کہ امریکہ کے پبلک اسکولوں میں بچوں کو قرآن کی آیات زبانی یاد کرنے کو کہا گیا اور خفیہ ایجنسی ایف بی آئی کے افسران کو اسلام سے روشناس کرایا جانے لگا ہے۔

(اسلام کی سچائی اور سائنس کے اعترافات از: آئی اے ابراہیم ص ۱۹۶، مطبوعہ دار اسلام، پاکستان)

لاطینی امریکی تارکین وطن اسلام کی آغوش میں:

میکسیکو سے لے کر براعظم جنوبی امریکہ کے انتہائی جنوبی ممالک ارجنٹینا اور چلی تک کا خطہ لاطینی امریکہ کہلاتا ہے۔ ۱۴۹۲ء میں کولمبس کے ذریعہ امریکہ کی دریافت کے بعد اسپین اور پرتگال کے استعماری قبضہ کے سبب یہاں ہسپانوی (Spanish) اور پرتگالی (Portuguese) زبانیں بولی جاتی ہیں جو کہ لاطینی الاصل ہیں۔ غربت و افلاس کے شکار لوگ بہتر مستقبل کی تلاش میں ہر سال شمالی امریکہ خاص طور سے ریاستہائے متحدہ امریکہ کا

رخ کرتے ہیں ان میں بہت سے لوگ یہاں آکر اسلام سے متعارف ہوتے ہیں اور حلقہ بگوش اسلام ہوجاتے ہیں۔

چند سالوں قبل واشنگٹن پوسٹ نیوز سروس کے حوالے سے روزنامہ ''ڈان'' نے ریاستہاے متحدہ امریکہ (USA) میں آباد لاطینی تارکین وطن کے قبول اسلام کے بارے میں ایک ہندو صحافی سدرشن رگھون کی ایک رپورٹ شائع کی جس کے اقتباسات ذیل کی سطور میں ملاحظہ کریں:

''امریکہ میں لاطینی تارکین وطن اسلام کے ذریعہ سے از سر نو اپنی شناخت قائم کررہے ہیں۔ واشنگٹن کے علاقے میں ان نومسلموں کی تعداد چند سو ہے اور اسلامی تنظیموں کے مطابق پورے ملک میں ان کی تعداد ۴۰ تا ۷۰ ہزار ہے۔ ترک وطن سے پہلے وہ اپنے ملک میں (کیتھولک میسحیت کے حلقہ بگوش ہونے کے باعث) دوسرے نظریات سے یکسر بے خبر رہتے تھے مگر امریکہ آکر ان کے لیے قرآن مجید کے تراجم، اسلامی جرائد اور ویب سائٹس کے ذریعہ اسلام کے متعلق جاننا کہیں آسان ہوگیا ہے۔ ۱۱/ستمبر کے بعد امریکہ میں جیسے ہی وہ اسلام قبول کرتے ہیں، انھیں اسلام پر قائم رہنے کے لیے بہت جد و جہد کرنی پڑتی ہے اور مسیحی اکثریت کی طرف سے مخالفت اور تعصب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔''

(اسلام کی سچائی اور سائنس کے اعترافات، ص:۶-۲۰۴، مطبوعہ: مکتبہ دار السلام، سال اشاعت: ۲۰۰۷ء)

اسپین میں اسلام کی واپسی:

اسپین (اندلس) مشرقی یورپ کا وہ خوبصورت اور خوش حال ملک ہے جس کی پیشانی پر مسلمانوں کی آٹھ سو سالہ عظمتِ رفتہ کے نقوش ثبت ہیں۔ مسلمانوں کے دور حکومت (۹۲ھ/۷۱۱ء تا ۸۹۷ھ/۱۴۹۲ء) میں اسپین علم و دانش اور فکر و فن کا مرکز تھا، اور یہ حقیقت ہے کہ یہاں سے مغرب کو منتقل ہونے والے سائنسی علوم ہی یورپ کی نشأۃ اولی کا سبب بنے۔

ایک ''ہسپانوی ماہر''''مارینٹو'' کا خیال ہے کہ آئندہ چند برسوں میں اسپین، یورپ میں سب سے زیادہ آبادی والا ملک بن جائے گا۔ اس کی ایک بنیادی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ اسپین

کے نومسلموں میں قدیم عربوں کی اولاد بھی شامل ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ سقوطِ اسپین کے وقت ان کے آباو اجداد کو زبردستی عیسائی بنالیا گیا تھا۔ بطور ثبوت وہ اپنی آنکھوں کی سیاہ رنگت کو پیش کرتے ہیں؛ کیوں کہ اصل ہسپانوی باشندوں کی آنکھیں بھوری ہیں۔ خونِ عرب ایک بار پھر ان کی رگِ حیات کو گرمارہا ہے اور انھیں اپنی اصل کی طرف واپسی پر مجبور کر رہا ہے۔

ایک میگزین کی رپورٹ کے مطابق حالیہ چند برسوں میں اسپین میں ۲۰/ہزار غیر مسلموں نے اسلام قبول کیا ہے۔ صرف غرناطہ میں ایک ہزار عیسائی اسلام کے دامن میں آچکے ہیں۔ سقوطِ اسپین (۱۴۹۲ء) کے بعد وہاں بچ جانے والے مسلمانوں کو جبراً عیسائی بنالیا گیا تھا اب انھیں کی اولاد تیزی سے دائرۂ اسلام میں داخل ہورہی ہے۔ (اسلام کی سچائی اور سائنس کے اعترافات، ص:۲۰۱، بحوالہ ''نوائے وقت'' لاہور ۷/۱۱/اکتوبر ۲۰۰۵ء)

تاریخ کا تسلسل اور بکثرت رونما ہونے والے حوادث و واقعات اس امر کی طرف کا اشارہ کر رہے ہیں کہ آئندہ سو برسوں میں دنیا کے نقشے پر اگر کسی مذہب کو اکثریتی مذہب ہونے کا شرف حاصل ہوگا تو وہ اسلام ہوگا؛ کیوں کہ صرف اسلام کے دامن میں یہ گنجائش ہے کہ وہ گوروں کے ساتھ کالوں، امیروں کے ساتھ غریبوں اور سماج کے ہر طبقات کے لوگوں کو اپنے اندر جذب کر سکے۔ رنگ و نسل، لسانی و تہذیبی عصبیت سے پاک اس مذہب میں ہر ایک کے لیے یکساں کشش موجود ہے۔ مادیت اور خواہش پرستی کی طوفان بدتمیزی میں روحانیت کا جام پلانے والا صرف اسلام ہے۔ عورتوں کی عصمت صرف اسلام میں محفوظ ہے۔

مغرب تمام تر مادی وسائل کے باوجود بے چین و بے اطمینانی کی زندگی گزار رہا ہے۔ اس کا خاندانی نظام بکھر چکا ہے۔ اب اسے سکون کی تلاش ہے۔ مگر سکون ملے تو کیسے؟ عیسائیت کا کلیسائی نظام خود دم توڑ چکا ہے۔ گرجاگھروں میں خاک اڑ رہی ہے۔ معابد ویران ہیں۔ تثلیث کے عقیدہ نے عیسائیت کی تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی ہے۔ اب بیساکھی کے سہارے زیادہ دنوں تک اس کو چلایا نہیں جاسکتا۔ اب تعقل پرستوں کو کسی متبادل مذہب کی تلاش ہے جس کے دامن میں اسے روحانیت نصیب ہوسکے۔ ایسے موافق حالات میں جسے قدرت کئی

سو سال کے بعد پیدا کرتی ہے۔ اہل اسلام پر اس عہد کی سب سے بڑی ذمہ داری یہ عائد ہوتی ہے کہ اس کے پاس جو ابدی صداقت ہے اور جو دین تمام آمیزشوں سے پاک ہے اسے بلاکم و کاست خدا کے بھٹکے ہوئے بندوں تک موجودہ وقت کے معیار کے مطابق پہنچائیں۔

آج مسلمان پوری دنیا میں مدعو قوموں کے ساتھ غیر ضروری نزاعی امور میں الجھے ہوئے ہیں اور اپنے عمل سے اسلام کو جنگ کا مذہب بنائے ہیں۔

مسلمانوں کے لیے لمحہ فکریہ:

بیسویں صدی کے اواخر اور اکیسویں صدی کے اوائل میں ایک بڑا امکان واقعہ بننے سے اس لیے رہ گیا کہ اسلامی قیادت کے نام پر القاعدہ، طالبان، حزب المجاہدین، لشکر طیبہ اور جیش محمد جیسی غیر سرکاری مسلح تنظیمیں وجود میں آگئیں اور جہادِ اسلامی کے نام پر حکومتوں سے جنگ چھیڑ دی گئی۔ کچھ شر پسند اسلام دشمن عناصر نے ان تنظیموں سے منسلک افراد کی ذہن سازی اس انداز میں کی کہ غیر اسلامی حکومت ان کی نظر میں اس قابل ہوگئی کہ اسے فوراً مٹا دیا جائے۔ اور اس کی جگہ حکومت اسلامیہ کا قیام عمل میں لایا جائے، نہ حالات کو دیکھا نہ تاریخی تسلسل کو بس ہر غیر مسلم حکومت کے خلاف مسلح جہاد شروع کر دیا۔ کرتا، پاجامہ، عمامہ اور ٹوپی میں ملبوس داڑھی والے مجاہدین جب ٹی وی چینلز کی اسکرینوں پر مسلح جہاد کرتے ہوئے نظر آئے تو پوری دنیا میں ان کی شبیہ انتہا پسند اور دہشت گردانہ عمل انجام دینے والے کی شکل میں متعارف ہوگئی۔ رفتہ رفتہ یہی اکثر مسلمانوں کی شبیہ بن گئی۔ اب جہاں اس حلیہ کے آدمی نظر آئے ان کو اسی فریم ورک میں دیکھا جانے لگا۔ اب بجائے اس کے کہ اسلام کی طرف لوگوں کی واپسی ہوتی پوری دنیا کی غیر مسلم اقوام اسلام سے برگشتہ اور مسلمانوں سے متوحش ہوگئیں اور یورپ کے اسلام کی طرف آنے کا اتنا بڑا امکان دہشت گردانہ عمل کے ارتکاب کے سبب واقعہ بننے سے رہ گیا۔

دور شرک اور دور جمہوریت کا فرق:

قدیم زمانہ میں پوری دنیا کے اندر شرک کا غلبہ تھا، مشرکانہ عقائد لوگوں کے ذہنوں پر چھائے ہوئے تھے۔ وہ اصل خدا کو چھوڑ کر مظاہر فطرت کو خدا بنائے ہوئے تھے۔ جب دور اسلام آیا تو اس نے شرک کو مغلوب کر کے توحید کو غالب فکر بنا دیا۔ پچھلے زمانہ میں شرک کو سرکاری مذہب کا درجہ

حاصل تھا۔ لہذا شرک کو چھوڑ کر توحید کو اختیار کرنا سیاسی قوتوں کو چیلنج کرنے کے مترادف تھا۔ لیکن اللہ تعالی نے ہزار سالہ عمل کے بعد انسان کو اس دور میں داخل کر دیا کہ شرک اب انسان کا سیاسی عقیدہ نہیں رہ گیا۔ وہ دور جمہوریت کا دور ہے، جس میں انسان کو فکری اور مذہبی آزادی حاصل ہے ۔اب بادشاہوں اور حکمرانوں کی طرف سے ٹکراؤ کے وہ سارے امکانات ختم ہو گئے جو دور شرک میں پیش آسکتے تھے۔ لہذا دعوت کا عمل پہلے سے کہیں زیادہ دور جمہوریت میں آسان ہو گیا ہے۔ پہلے اسلام قبول کرنے کے بعد حکمرانوں سے ٹکرانا پڑتا تھا اب صرف اپنے خاندان یا خویش و اقارب سے نمٹنا ہوتا ہے۔ ہندوستانی معاشرے میں چوں کہ اب بھی سماجی و مذہبی بندھن میں لوگ کسی حد تک بندھے ہوئے ہیں اس وجہ سے یہاں اسلام قبول کرنے والوں کو مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لیکن یورپی ممالک میں ایسی کوئی رکاوٹ نہیں ہے، اس لیے اسلام ان خطوں میں تیزی کے ساتھ پھیلتا چلا جا رہا ہے۔

اب اگر دور جمہوریت میں ہم دعوت الی اللہ کا فریضہ انجام نہ دیں تو یہ نعمت الہی کی انتہائی بے قدری ہوگی اور اس امکان کو ضائع کرنا بھی ہوگا جو قدرت نے ہزار سالہ عمل کے بعد ہمیں فراہم کیا ہے۔

آج کا تقاضا یہ ہے کہ دنیا کی مختلف زبانوں میں اسلام کے تعارف پر مشتمل لٹریچر سادہ و عقلی انداز میں تیار کر کے مفت تقسیم کیے جائیں۔ قرآن مجید کے تراجم ہر غیر مسلم کے گھر میں بطور تحفہ پہنچائے جائیں۔ حکمراں طبقہ سے لے کر عوام تک اسلام کی پر امن تعلیمات پہنچائی جائیں۔ جو تنظیمیں مسلسل مسلمانوں کے خلاف کام کر رہی ہیں مثلا بجرنگ دل، شیوسینا، وشوہندو پریشد وغیرہ ان کی آفسوں میں بھی اسلام کے تعارف پر مشتمل کتابیں بھیجی جائیں۔ جب اللہ تعالی تاتاری اور سلجوقی جیسے وحشی لوگوں کے دل ایمان کی طرف پھیر دیتا ہے تو ان مخالفین اسلام لوگوں کے دل بھی اسلام کی طرف پھیر سکتا ہے۔ یہ کوئی ضروری نہیں کہ اللہ تعالی دین کی تقویت کا کام صرف پیدائشی مسلمانوں سے لے بلکہ اپنے دین کی تائید نئے نفوس کو اسلام میں داخل کر کے بھی کرتا ہے۔

پرنسپل: جامعہ حضرت نظام الدین اولیا، نئی دہلی

محررہ: شعبان ۱۴۳۴ھ/جون ۲۰۱۳ء

عُسر کے ساتھ یسر

قادر مطلق نے اس کائنات (Universe) کو اس طرح بنایا ہے کہ یہاں ہمیشہ عُسر (Difficulty) کے ساتھ یُسر (Easiness) بھی رہا ہے، یہ فطرت کا اصول ہے کہ جہاں عسر (تنگی) پایا جاتا ہے وہیں یسر (آسانی) کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور پایا جاتا ہے، اس دنیا میں بارہا ایسا ہوا ہے کہ جہاں مسائل کی وجہ سے حالات ناموافق ہوئے ہیں وہیں موافق حالات بھی موجود رہے ہیں۔ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا بے شک دشواری کے ساتھ آسانی ہے۔(الانشراح: ۵) یہ دنیا کانٹوں بھری دنیا ہے، قدم قدم پر رکاوٹیں ہیں، بامقصد انسان مسائل میں الجھے بغیر اپنا سفر آگے کی طرف جاری رکھتا ہے اور منزل تک پہنچ جاتا ہے جب کہ مسائل میں الجھنے والے زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ جاتے ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ جب تک یہ رکاوٹیں ختم نہ ہوں ہمارا سفر شروع ہی نہیں ہو سکتا۔ جب کہ ان مسائل سے اِعراض کرتے ہوئے بھی اپنے مشن کو جاری رکھا جا سکتا ہے۔

زندگی میں ناکامی کا سبب اکثر یہ ہوتا ہے کہ لوگ مسائل میں الجھ جاتے ہیں، ان کی نگاہیں صرف عُسر والے پہلو پر مرکوز ہوتی ہیں، اور یسر کے پہلو ان کی نگاہوں سے اوجھل ہوتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ٹکراؤ ہی مسئلے کا واحد حل ہے اِعراض کا پہلو انہیں نظر نہیں آتا۔

اس سلسلے میں ہمارے لیے رہنما مثالیں سرکار دو عالم ﷺ کی مکی دور کی زندگی میں بکثرت ملتی ہیں۔ عمر کے چالیسویں سال آپ نے اپنی نبوت کا اظہار اپنے گھر والوں اور قریبی رشتہ داروں میں فرمایا۔ تین سال تک اسلام کی خفیہ تبلیغ فرماتے رہے۔ جب یہ آیت کریمہ اتری فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَ اَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ (الحجر، ۹۵) آپ کو جس کا حکم دیا گیا ہے اس کا کھلم کھلا اعلان کر دیں اور مشرکین سے اعراض کریں، تو آپ نے صفا پہاڑ کی چوٹی پر کھڑے ہو کر علی روس الاشھاد لوگوں کو اسلام کی طرف بلایا۔ اس آیت مبارکہ میں دو جملے ہیں اور دونوں میں دو الگ الگ رہنما اصولوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ پہلے جملے کا مفہوم یہ ہے کہ آپ اسلام کی تبلیغ خفیہ طور پر نہیں بلکہ اعلانیہ طور پر کریں جس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ

قوم آپ کی دشمن ہوجائے گی اور آپ کے لیے عسر کے حالات پیدا ہوں گے، لیکن اسی کے ساتھ یسر کے دوسرے پہلو کو بھی واضح کر دیا گیا کہ جب عسر کے سبب ناموافق حالات پیدا ہو جائیں تو آپ اعراض اور درگزر سے کام لیں جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ کو اپنی انرجی (Energy) ضائع کیے بغیر کام کے مواقع مل جائیں گے۔

اور واقع میں بھی ایسا ہی ہوا کہ آپ کے ربانی مشن کے نتیجے میں اگر کافروں نے راہ میں کانٹے بچھائے اور جسم نازنین پر پتھر برسائے تو دوسری طرف اصحاب رسول کی وہ اعلی ترین جماعت تیار ہوئی جس نے توحید و رسالت کے اس مشن کو پورے عرب میں پھیلانے کا کام انجام دیا اور اپنی جانوں کو نبی کے قدموں پر نثار کر دیا۔

اس سلسلے میں ہمارے لیے رہنما مثال صلح حدیبیہ ہے۔ حدیبیہ پالیسی (٦ھ) اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ ہے کہ صورت موجودہ میں جو مشکلات ہیں ان کو نظر انداز کرنا اور ان مشکلات کے باوجود جو امکانات ہیں ان کو استعمال کرنا۔

ہم دیکھتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ ہجرت کے چھٹے سال تقریباً ڈیڑھ ہزار صحابہ کے ساتھ عمرہ کے ارادہ سے نکلے۔ مکہ سے قریب حدیبیہ کے مقام پر مشرکین مکہ نے مسلمانوں کو روک لیا اور کہا کہ مسلمان اس سال عمرہ نہیں کریں گے۔ حالات اتنے کشیدہ ہوئے کہ مسلمانوں کو صلح کرنی پڑی۔ کہا جاتا ہے کہ تاریخ میں یہ پہلی صلح تھی جس میں فریق مخالف کی تمام کڑی کڑی شرطوں کو یکطرفہ طور پر قبول کر لیا گیا۔

وہ شرطیں یہ تھیں:

مسلمان اس سال عمرہ نہیں کریں گے۔

دوسرے سال عمرہ کے ارادہ سے آئیں گے اور مکہ میں صرف تین دن تک ٹھہر سکیں گے۔

تیسری یہ کہ ہمارا کوئی آدمی مدینہ چلا جائے تو اہل مکہ اسے واپس کرنے پر مجبور ہوں گے۔ اگر مدینہ سے کوئی مسلمان مکہ آیا تو ہم اسے واپس نہیں کریں گے۔

چوتھی کڑی شرط یہ تھی کہ صلح نامے پر جو مہر لگائی جائے اس میں محمد رسول اللہ کے بجائے محمد بن عبداللہ لکھا جائے؛ کیوں کہ ہم نے آپ کو رسول اللہ تسلیم کیا ہی نہیں ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے حالات موجودہ کو دیکھتے ہوئے ان کی یک طرفہ شرطوں کو منظور کر لیا، اور ان شرطوں کو مان لینے کے بعد مسلمان اور کافروں کے درمیان دس سال کے لیے ناجنگ معاہدہ ہو گیا۔

اس پالیسی کو دوسرے لفظوں میں اسٹیٹس کوازم بھی کہا جا سکتا ہے، یعنی صورت موجودہ کو بدلے بغیر اس کو وقتی طور پر مان کر اپنے لیے آگے کا راستہ نکالنا۔

صلح حدیبیہ بظاہر پسپائی اور ذلت کا معاہدہ نظر آتا ہے لیکن نتیجہ کے اعتبار سے یہ ایک دوراندیش حکیمانہ عمل ہے۔ اسی معاہدہ کی تکمیل کے بعد قرآن کی وہ سورہ اتری جس میں حدیبیہ معاہدہ کو فتح مبین کہا گیا ہے۔

پیغمبر اسلام ﷺ کی نگاہ بصیرت دیکھ رہی تھی کہ اس عسر میں یُسر کا بہت بڑا پہلو پوشیدہ ہے جہاں حالات بظاہر، موافق دکھائی دیتے ہیں وہیں ہمارے لیے موافق حالات بھی موجود ہیں۔

مشہور محدث اور تابعی ابن شہاب زہری کہتے ہیں:

فما فتح في الإسلام فتح قبله كان أعظم منه۔ إنما كان القتال حين التقى الناس۔ فلما كانت السدنة وضعت الحرب و أمن الناس بعضهم بعضا و التقوا فتفاوضوا في الحديث۔

ٹکراؤ اور اعراض

یہ دنیا جس قانون فطرت کے تحت بنی ہوئی ہے اس کے مطابق یہاں اختلاف کا پایا جانا ایک فطری عمل ہے، اس کو روکا نہیں جاسکتا۔ اگر کسی کو اختلاف سے خالی معاشرہ (Society) کی تلاش ہو تو اسے اس زمین کو چھوڑ کر کسی اور زمین کا انتخاب (Choice) کرلینا چاہیے؛ کیوں کہ اختلاف سے خالی معاشرہ اس زمین پر ممکن نہیں۔

اس فطری اختلاف کے نتیجہ میں بسا اوقات وہ صورت حال پیدا ہو جاتی ہے جسے ہم ٹکراؤ سے تعبیر کرتے ہیں، اس کی ابتدا تشدد اور انتہا پسندی سے ہوتی ہے اور انتہا ناکامی اور محرومی پر۔ اس انتہائی صورت حال سے نمٹنے کے لیے اسلام نے ایک اصول بتایا ہے اور وہ اعراض ہے۔

ٹکراؤ (Confrontation) اپنی حقیقت کے اعتبار سے ایک انتہا پسندانہ عمل ہے، اور اعراض اعراض (Avoidance) امن پسندانہ عمل ہے۔ ٹکراؤ متشددانہ عمل ہے اور اِعراض حکیمانہ تدبیر، ٹکراؤ کا نتیجہ تخریب ہے اور اعراض کا نتیجہ تعمیر، اعراض ایک مطلوب عمل ہے (الحجر ۹۵) جب کہ ٹکراؤ غیر مطلوب عمل ہے۔ ٹکراؤ کی انتہا ناکامی پر ہوتی ہے جب کہ اعراض کی انتہا کامیابی پر۔

اس زمین پر مختلف اَدیان و مذاہب، متنوع تہذیب و تمدن، اور مختلف الآرا افکار و نظریات کے نتیجے میں باہمی امور و معاملات میں نزاعی صورت حال کا پیدا ہونا فطری بات ہے، اب یہ آدمی کی اپنی سوچ پر منحصر ہے کہ وہ ان نزاعی معاملات میں اپنا مطلوب ٹکراؤ کی راہ سے حاصل کرے یا پُرامن رہ کر اعراض کے طریقہ پر۔ جب حالات ناموافق ہوجائیں اور ٹکراؤ کی صورت پیدا ہوجائے تو اسلامی نقطۂ نظر سے صورت موجودہ کو اپنے حال پر باقی رکھتے ہوئے اعراض کا طریقہ اختیار کیا جائے، اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ مسائل میں الجھے بغیر دوبارہ کام کے مواقع مل جائیں گے۔

رسول خدا ﷺ کی زندگی میں اس کے بے شمار شواہد موجود ہیں۔ اسلام کی اعلانیہ دعوت کے نتیجہ میں کافروں کی طرف سے جب مخالفانہ ردعمل کا سامنا کرنا پڑا تو سرکار دوعالم ﷺ نے اِعراض کا طریقہ اختیار فرمایا۔ تین سالہ سری تبلیغ (**Hidden Preaching**) کے بعد اللہ تعالی نے اپنے نبی کو اعلانیہ تبلیغ (**Public Preaching**) کا حکم دیا اور کہا گیا کہ اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈر سنادیں اور مومنین کے لیے اپنے بازوے رحمت کو بچھادیں۔

وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ

(الشعراء۲۱۵،۲۱۴ء)

اس آیت کے اترنے کے بعد سرکار دوعال صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خاندان اور قبیلہ قریش کے لوگوں کو جمع کیا، خود صفا پہاڑی پر چڑھ گئے اور وہاں سے قریش کی مختلف شاخوں (بنو فہر، بنوعدی و غیرھما) کو آواز دینے لگے۔ لوگ آپ کی آواز سن کر آپ کی طرف متوجہ ہوئے، جو خود نہ آسکا اس نے اپنا نمائندہ بھیجا تاکہ معاملہ کی حقیقت معلوم کرے، کہا جاتا ہے کہ اس موقع پر قریش کے بڑے بڑے سردار اکٹھا ہو چکے تھے جس میں ابولہب بھی شامل تھا اب صفا کی چوٹی سے توحید کا وہ نغمۂ دلنواز بلند ہونے والا ہے جس کے قبول کر لینے میں انسانیت کی نجات اور دائمی فیروزبختی مقدر ہے اور نہ کرنے میں دائمی ہلاکت۔ رسول اللہ ﷺ اپنی قوم سے اس طرح مخاطب ہوئے: اے لوگو! بتاؤ اگر میں تمھیں یہ خبر دوں کہ پہاڑ کے اس پار وادی میں ایک لشکر ہے جو تم پر حملہ آور ہونا چاہتا ہے، تو کیا تم اسے مان لو گے؟ سب نے بیک آواز کہا ہاں! ہم نے تو آپ کو ہمیشہ سچا ہی پایا ہے۔ پھر آپ نے فرمایا: میں تمھیں سخت عذاب سے ڈرانے کے لیے آیا ہوں، اس کلام کو سن کر لوگ خاموش رہے، لیکن ابولہب غیظ و غضب کے عالم میں جل بھن اٹھا اس نے کہا: **تبا لك يا سائر اليوم، ألهذا جمعتنا؟** تمھارے لیے دائمی تباہی ہو! کیا تم نے ہم سب کو اسی لیے جمع کیا تھا، ابولہب کے اس جارحانہ کلام پر نبی خاموش رہے کوئی جواب نہ دیا اعراض کا طریقہ اختیار فرمایا، رب العلمین نے اپنے محبوب کے

دشمن کا جواب انتہائی جلال اور ہیبت بھرے انداز میں دیا: تبت يدا ابي لهب و تب ما أغنى عنه ماله و ما كسب.

قال: لما نزلت: و انذر عشيرتك الاقربين و اخفض جناحك لمن اتبعك من المؤمنين. صعد النبي صلى الله عليه و سلم على الصفا فجعل ينادي يا بني فهر يا بني عدي لبطون قريش حتى اجتمعوا فجعل الرجل إذا لم يستطع أن يخرج أرسل رسولا لينظر ما هو، فجاء أبولهب و قريش فقال: أرأيتكم لو أخبرتكم أن خيلا بالوادي تريد أن تغير عليكم أكنتم مصدقي؟ قالوا: نعم، ما جربنا عليك إلا صدقا. قال فإني نذير لكم بين يدى عذاب شديد فقال أبو لهب: تبا لك يا ساير اليوم! ألهذا جمعتنا؟ فنزلت: تبت يدا أبي لهب و تب ما أغنى عنه ماله و ما كسب و في رواية: ناداهم بطنا بطنا، و يقول لكل بطن: أنقذوا أنفسكم من النار. (صحيح البخاري: كتاب التفسير سورة الشعراء)

اعلانیہ طور پر دعوت اسلام کے نتیجے میں قوم آپ کی دشمن ہوگئی، اسلام اور اس کے پیغمبر کے مشن کے خلاف غلط پروپیگنڈے کیے گئے، دعوت کے عمل کو روکنے کے لیے مختلف اسالیب کافروں نے اختیار کیے، جو سب کے سب ظلم وجبر پر منتہی ہوتے ہیں۔ جو لوگ اسلام مذہب اختیار کرتے وہ ان کے دار وگیر اور مظالم کا نشانہ بنتے۔ اہل اسلام کے اندر ان زیادتیوں کے نتیجے میں ردعمل کی نفسیات کا پیدا ہو جانا فطری امر تھا۔ ایسے موقع پر ان کی رہنمائی کی گئی اور کہا گیا۔ فَاصۡدَعۡ بِمَا تُؤۡمَرُ وَ اَعۡرِضۡ عَنِ الۡمُشۡرِكِيۡنَ آپ کو جو حکم ہوا ہے برملا اس کا اعلان کردیں اور مشرکین سے اعراض کریں۔ (الحجر، ۹۵) یہ خطاب اگر چہ بلاواسطہ نبی سے ہے لیکن بالواسطہ تبع امت کو بھی شامل ہے۔

اسلام کی دعوت بڑی تیزی کے ساتھ مکہ کے ذہین اور بااثر لوگوں کو متاثر کر رہی تھی۔ مشرکوں پر یہ صورت بڑی شاق گزری، ان کی مسلسل ریشہ دوانیوں سے مکہ کے حالات مسلمانوں کے حق میں انتہائی حد تک ناموافق ہو گئے، لیکن مسلمانوں نے صبر اور اعراض کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے دعوتی کاموں کو مسلسل جاری رکھا، اور نئے نئے مواقع تلاش کیے۔

اگر ایسے موقع پر اعراض کی جگہ ٹکراؤ کا طریقہ اختیار کیا جاتا تو تاریخ کا یہ عظیم انقلاب صحرائے عرب سے ظہور میں نہ آتا۔

بعض نوجوان صحابہ پر صبر واعراض کی یہ پالیسی شاق گزری وہ حضور ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے، انھیں لوگوں میں حضرت عبدالرحمن بن عوف بھی تھے اور عرض کیا یانبي الله ! كُنَّا فِيْ عِزَّةٍ وَ نَحْنُ مُشْرِكُوْنَ فَلَمَّا اٰمَنَّا صِرْنَا اَذِلَّةً اے اللہ کے نبی جب ہم حالت کفر میں تھے باعزت تھے اور جب مسلمان ہوئے تو ذلیل ہو گئے۔ تو نبی اکرم ﷺ نے یہ جواب ارشاد فرمایا: إني أمرت بالعفو فلا تقاتلوا القوم مجھے عفو ودرگزر کا حکم دیا گیا ہے تو اے لوگو تم بھی مشرکوں سے لڑائی مول نہ لو۔ (''السیرۃ النبویہ'' للدکتور محمد الصلابي، ۱۲۴۔ مطبوعہ بیروت)

(طلبۂ جامعہ اشرفیہ، مبارک پور سے خطاب ۲۳؍ مارچ ۲۰۱۷ء)

عنوان

اکیسویں صدی اور علمائے اسلام کی ذمہ داریاں

قوموں کا زوال ان کے تخیل پہ ہے موقوف

وہ قوم نہیں لائق ہنگامۂ فردا
جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے

میرے عزیز بھائیو! قوم مسلم کے مستقبلو! غروب شفق کے بعد طلوع ہونے والے روشن ستارو!

آج کے موضوعِ گفتگو پر ہمیں سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ اس کائنات میں محکم نظام ہے ''لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی'' خوابوں کی تعبیر انھیں قوموں کو ملتی ہے جو خواب دیکھنے کا ہنر رکھتے ہیں۔ آج ہماری قوم احساس ندامت، اور شعور کمتری سے بوجھل ہے، مایوسی ان کا مقدر بنتی نظر آرہی ہے۔ ہماری قیادت کی پستی، منصوبہ بندی اور پلاننگ کے فقدان نے آج ہمیں جس راہ پر لاکر کھڑا کیا ہے اور جس کربناک عہد سے ہند و بیرون ہند کے مسلمان گزر رہے ہیں وہ یقینا ہمارے مردہ ضمیر کو جھنجھوڑنے کے لیے کافی ہے۔ طاقت کے عدمِ توازن نے مسلم ممالک کو یہود و نصاریٰ کے قدموں کا فٹ بال بناکر رکھ دیا ہے۔ عالمی سطح پر مسلمانوں کی فکری پستی، دقیانوسی سوچ، اتحاد کے فقدان اور عدم برداشت کے مزاج نے ہمیں آپس ہی میں خود، دست و گریباں کر دیا ہے۔ اس وقت تمام طاغوتی طاقتیں اپنے تمام تر شدید اختلافات کو بھلا کر اَلْکُفْرُ مِلَّۃٌ وَّاحِدَۃ کے تحت مسلمانوں کے خلاف صف آرا ہو چکی ہیں۔ یہود و نصاریٰ اور مشرکین پھر ایک بار ایک پرچم تلے جمع ہوکر اکیسویں صدی میں مسلم ممالک کے ساتھ وہی حشر کرنا چاہتے ہیں جو ساتویں صدی ہجری میں چنگیز اور ہلاکو کی وحشی اور درندہ فوجوں نے مسلمانوں کے ساتھ کیا تھا۔

ابن خلدون نے اس عہد کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے اس زمانہ کی ایک خاص بات یہ لکھی ہے کہ جس وقت ہلاکو خان کی وحشی فوج بغداد کی فصیلوں پر دستک دے رہی تھی۔ خوارزم، رے،

ہمدان، قزوین اور ماوراءالنہر کے علاقے تباہ ہو چکے تھے، اس پر فتن عہد میں بھی بغداد کے اندر شیعہ اور سنی کے درمیان مناظرہ کی مجالس بڑی دھوم دھام سے منعقد کی جاتی تھیں۔ باہمی اختلافات کا نتیجہ بیسیوں لاکھ انسان کی تباہی کی شکل میں سامنے آیا۔ ۱۴۹۲ء میں سقوط اسپین ہوا۔ عیسائی افواج اسپین کا محاصرہ کر چکی ہیں۔ لیکن ابوعبداللہ غرناطہ کے ''القصر الحمرا'' میں عیش وطرب کی محفل میں مست ہے۔ یہی صورت حال آج ہم عرب ممالک کے اندر دیکھ رہے ہیں۔ ان عربوں کی عیاشی اور عیش پرستانہ زندگی اور ان کی دائمی غفلت و کوتاہی نے یہود و نصاریٰ کو حرمین طیبین جیسی سرزمین، بشمول فلسطین، عراق، شام، یمن اور مصر میں مداخلت کا موقع فراہم کیا۔

ہندوستان جیسی مقدس سرزمین پر جو بجا طور پر ''ارض الانبیا والاولیا'' ہے۔ جہاں سے انسانیت کی ابتدا ہوئی، جہاں سے توحید کا نغمہ لا ہوتی سب سے پہلے بلند ہوا، جس سرزمین سے ابوالبشر سیدنا آدم، سیدنا شیث، سیدنا نوح علیہم الصلوۃ والسلام کی تاریخ جڑی ہوئی ہے، جہاں دنیا کے سب سے پہلے انسان، مذہب اسلام کو لے کر جلوہ گر ہوئے، ہمارے داخلی و خارجی انتشار، مختلف مسالک و مشارب میں تقسیم، گروہی عصبیت اور قبائلی حمیت، مسلم قیادت کے فقدان اور خانقاہوں کے عدم اتحاد کے سبب فسطائی اور مسلم دشمن عناصر کو اس ملک میں اپنی جڑیں مضبوط کرنے کا موقع ملا۔

مسلم علمائے دین، زعمائے سیاسیین اور عوام مسلمین سب پر یہ مشترکہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ آنے والے وقت کے لیے ہم ابھی سے منصوبہ بندی کریں۔ اور باطل طاقتوں کے خلاف ایک ہو جائیں۔ آج کا دور ہمیں مکی دور کا احساس دلا رہا ہے۔ آج ہمارے پاس نہ حکومت ہے، نہ فوجی قوت، نہ اسلحہ کی طاقت۔ اگر کوئی طاقت ان کے ناپاک عزائم کو ختم کر سکتی ہے تو وہ اتحاد عظیم کی طاقت ہے۔

کیا سیرت نبوی اس سلسلے میں ہماری رہنمائی نہیں کرتی ہے؟

آپ لوگ اچھی طرح جانتے ہیں کہ جب مدینہ میں اسلامی ریاست کی بنیاد رکھی گئی تھی تو ہمیشہ بیرونی حملہ آوروں کا خطرہ لگا رہتا تھا۔ اس وقت کی حکمت عملی کے تحت پیغمبر اسلام نے مسلمان، یہود و نصاریٰ اور دیگر قبائل مدینہ و اطراف کے ساتھ ایک اقوام متحدہ تشکیل دیا تھا، جس میں یہ طے پایا تھا کہ اگر کوئی بیرونی طاقت ہم پر حملہ آور ہوتی ہے تو ہم سب مل کر اس کا مقابلہ کریں گے۔ کیا آج کا عہد اس کا مطالبہ نہیں کرتا کہ ہم کلمہ گو مسلمانوں اور سیکولر مزاج قوموں کو ملا کر ایک متحدہ پلیٹ فارم تشکیل دیں اور اس کی قیادت مسلمان کریں۔ جس طرح اپنے عہد کی اقوام متحدہ کی قیادت سرکار نے کی تھی؟

دعوت اسلام کے لیے موافق حالات

انیسویں اور بیسویں صدی کو اس اعتبار سے غیر معمولی اہمیت حاصل ہے کہ تاریخ کی اہم ترین تبدیلیاں ان دو صدیوں میں رونما ہوئیں اور اکیسویں صدی تتمہ ہے ان دو صدیوں کی، یہ ایک حقیقت ہے کہ انیسویں و بیسویں صدی یورپ میں جدید سائنس اور ٹکنالوجی کے عروج و ارتقا کی صدیاں ہیں، ان دو صدیوں میں انسانی افکار میں حیرت انگیز تبدیلیاں آئی ہیں، جس کے نتیجے میں لوگوں کی سوچ وفکر کا انداز بدل گیا، انتخاب کا معیار بدل گیا، طرزِ زندگی بدل گئی، ترجیحات میں تبدیلی آگئی۔

جدید انکشافات اور نت نئی ایجادات نے پوری دنیا کو اپنی طرف متوجہ کر لیا اور اس کے اثرات نہ صرف معاشرتی اقدار و روایات پر مرتب ہوئے بلکہ مذہبی اقدار و افکار بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ہر چیز کو ایک ہی پیمانہ پر پرکھا جانے لگا۔ یہاں تک کہ مذہب کے اصولوں کو بھی سائنس کی تھیوری پر پرکھا جانے لگا، جب کہ مذہب اور سائنس میں جو بنیادی فرق ہے اس کو نظر انداز کیے بغیر ان کا یہ قدم سراسر غیر منطقی تھا۔ مذہب کی اصل یہ ہے کہ وہ مادیت اور روحانیت دونوں سے تشکیل پاکر مذہب کی صورت اختیار کرتا ہے، جب کہ سائنس کی اساس صرف مادہ ہے وہ مابعد الطبیعیات سے بحث نہیں کرتی، روحانیات اس کے دائرۂ فکر سے باہر کی چیزیں ہیں۔ اس لیے صرف سائنسی بنیادوں پر مذہب کی تفہیم بے حد مشکل ہے۔

یورپ کی نشاۃ ثانیہ کے بعد پہلی بار آزادانہ طور پر ریسرچ و تحقیق کے اعلیٰ سطحی ادارے قائم کیے گئے۔ اس تحقیق کے نتیجے میں دنیا کے غیر الہامی مذاہب جن کو تاریخ کے چند ذہین انسانوں نے محض اپنے ذہن سے گڑھ کر مذہب کے اصول کی شکل میں پیش کیا تھا، جن میں بنیادی طور پر امن، بھائی چارگی، نیکی اور محبت و رواداری کے چند رہنما اصول تھے، اور جس کو تاریخی طور پر کوئی اعتبار حاصل نہ تھا، ان محققین نے سب کو ناقابل عمل قرار دیا، جس میں بدھ ازم، ہندوازم، جین ازم، سکھ ازم اور کنفیوش ازم وغیرہ مذاہب شامل ہیں۔

مذکورہ مذاہب عالمی اور تاریخی طور پر غیر مستند اور ناقابل عمل ٹھہرے، رہے وہ

مذاہب جن کا الہامی ہونا تاریخ سے ثابت ہے اور جن پر یقین بھی کیا جاتا ہے وہ یہودیت، عیسائیت اور اسلام ہیں۔ ان میں اول الذکر دونوں مذاہب ،اِمتداد زمانہ کے ساتھ مسلسل تحریف، تغییر اور ترمیم کے نتیجے میں اپنا اعتبار کھو چکے ہیں اور ان کے تمام اصولوں کو ایک دائمی اور ثابت شدہ اصول کی طرح نہیں پیش کیا جاسکتا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ توریت وانجیل کی موجودہ صورتیں ایک مستند مآخذ کی حیثیت سے قائم نہ رہ سکیں۔ اب صرف "اسلام" باقی رہا جس کے قوانین اور نظریات پر گذشتہ دو صدیوں میں سب سے زیادہ تحقیقات ہوئیں، جدید سائنس تمام تر ترقیات کے باوجود فلسفۂ اسلام کے آگے سر خمیدہ رہی ہے۔ اس کے اصول کو سائنس نے رد نہیں کیا بلکہ تسلیم کیا ہے، مثال کے طور پر سائنسی تحقیق کے مطابق تمام جاندار کی تخلیق پانی سے ہوئی ہے جب اس اصول کو اسلام کی روشنی میں دیکھتے ہیں تو صد فیصد اس سے نظریۂ اسلام کی تائید ہوتی ہے۔ اللہ تعالی جانداروں کی تخلیق کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: **وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ** ہم نے ہر جاندار کو پانی سے بنایا۔

سائنس نے معجزہ شق القمر کی تردید نہیں بلکہ بیسویں صدی کے نصف آخر میں **Apolo-11** کے ذریعہ ناسا کی خلائی تحقیقاتی ادارے کی طرف سے ۲۰/جولائی ۱۹۶۹ء کو پہلی بار سائنسی ترقی کے نتیجے میں انسان کے لیے چاند پر قدم ڈالنا ممکن ہوا تو نیل آرم اسٹرانگ **Neil Armstrong** اور اس کے ساتھیوں نے اس بات کی تصدیق کی کہ کسی زمانے میں یہ چاند دو ٹکڑے ہوا تھا۔ اس قسم کی در جنوں مثالیں دی جاسکتی ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ جب دوسرے مذاہب "فکر جدید" کی کسوٹی پر پورا نہ اتر سکے تو مادیت زدہ اقوام کے اندر مذہب بیزاری کا عمل شروع ہوا اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ مذہب پر لوگوں کا یقین نہیں رہا۔ دنیا کی سب سے بڑی اکثریت عیسائیوں کی ہے لیکن خود ان کو عیسائیت میں یقین نہیں، اگر اس کا عملی طور پر مشاہدہ کرنا ہو تو یورپ کا سفر کیجیے۔ آج وہاں کلیساؤں کا کیا حال ہے؟ مذہب بیزاری کا عمل اس حد تک بڑھا کہ ہزاروں چرچ اسکولوں میں تبدیل کر دیے گئے، اور ہزاروں آج بھی ویران پڑے ہوئے ہیں، وہ محض ہفتہ واری تفریح کا ایک ذریعہ ہیں۔

عیسائیت سے لوگ کیوں بیزار ہورہے ہیں؟ اس کی کئی وجوہات ہیں ایک تو یہ کہ بائبل کے تمام نسخے (متی، لوقا، یوحنا اور مرقس) باہمی طور پر سخت تضادات کے شکار ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ آج کسی کے بارے میں محض یہ کہہ دینا کہ فلاں ایسا ہے یہ کوئی وزن نہیں رکھتا، اَوہام پرستی کا دور ختم ہو چکا، آج کسی بات کو منوانے کے لیے ضروری ہے کہ عقلی طور پر وہ ایک ثابت شدہ حقیقت بھی ہو۔

تثلیت کا عقیدہ جس میں حضرت عیسی علیہ السلام کو خدا کا بیٹا اور مریم عذرا رضی اللہ عنہا کو (معاذ اللہ) خدا کی بیوی فرض کیا جاتا ہے اور یہ اس جماعت کا اساسی عقیدہ ہے۔ بھلا آج کے اس سائنسی اور ترقی یافتہ دور میں کسی ذہن کو یہ کیسے **Address** کر سکتا ہے؟ ہرگز نہیں یہی وجہ ہے کہ یورپ، افریقہ اور امریکہ کی اکثریت آج مذہب بیزار ہے اور ان کے قدم اب لامذہبیت کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ لوگوں کا رجحان اب لادینیت کی طرف ہورہا ہے۔ برصغیر ہند کے تناظر میں اگر دیکھیں تو میں اپنے محدود تجربے کی روشنی میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہندوستان کے پچاس فیصد ہندوؤں کو ہندو مذہب میں یقین نہیں ہے۔ بالخصوص ہندو سماج کا وہ اعلی طبقہ جو تعلیم یافتہ ہے، وہ مذہب کو صرف پوجا پاٹ کا ایک دھرم سمجھتا ہے، مذہب بیزاری کا عمل بڑی تیزی کے ساتھ یہاں بھی پروان چڑھتا جارہا ہے۔ اس عمل کا شکار زیادہ تر وہ خطہ ہوا ہے جہاں اشتراکیت نے اپنا سایہ ڈال رکھا ہے، انیسویں صدی میں مارکسی نظریات نے اس فکر کو عام کرنے میں کلیدی رول ادا کیا تھا۔

ایسے وقت میں وہ تریاق صرف اسلام کے پاس ہے جو مذہب پر یقین، لوگوں کو دلی تسکین، حقیقی چین و سکون فراہم کر سکتا ہے، اسی کے اندر ہر طرح کے پر درپیش چیلنج کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت ہے۔

اب اہل اسلام کے لیے کرنے کا کام یہ ہے کہ وہ توحید کا مشن لے کر اٹھیں اور ان پیاسی روحوں تک خدا کا ابدی پیغام پہنچائیں، اس کا تعلق اس کے خالق و مالک سے جوڑ دیں، غیر ضروری میدانوں میں اپنی قوت ضائع کیے بغیر اپنی تمام تر توانائی سائنٹفک انداز میں اسلام کی تبلیغ پر صرف کر دیں، جبھی ہم خیر امت ہونے کا حق ادا کر سکتے ہیں ورنہ عنداللہ ہماری گرفت ہوگی کہ تم نے خدائی پیغام کو غیر مسلمین تک کیوں نہیں پہنچایا؟

تعلیمی مضامین

جدید ہندوستان میں مذہبی تعلیم اور عصری علوم کی شمولیت

مقالہ برائے: بین الاقوامی کانفرنس، مرکزی یونیورسٹی کشمیر
منعقدہ: ۳۰، ۳۱ر جولائی ۲۰۱۹ء
مقالہ نگار: مفتی محمد رضا قادری مصباحی
استاذ: الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور، اعظم گڑھ، یوپی

بعنوان: عصر حاضر میں مذاہب کی تعلیم: توقعات اور موانع

حَامداًوَ مُصَلِّیاًوَ مُسَلِّماً

زیر نظر سطور میں مذہبی تعلیم سے راقم سطور کی مراد مسلمانوں کی مذہبی تعلیم ہے، اسی تناظر میں ساری گفتگو ہوگی۔ آج کا ہندوستان کل کے ہندوستان سے بہت مختلف ہو چکا ہے۔ انیسویں و بیسویں صدی میں مغرب کے زیر اثر ظہور میں آنے والے سائنسی وصنعتی اور تمدنی انقلاب نے سوچ و فکر کا زاویہ بدل کر رکھ دیا ہے۔ جدید ہندوستان ایک سیکولر اسٹیٹ ہے جس کا نہ کوئی مذہب ہے نہ کوئی مذہبی کتاب بلکہ یہ ہر مذہب اور مذہبی اداروں کو آئین کے اندر رہتے ہوئے ترویج واشاعت کی اجازت دیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مذہب انسان کا انفرادی مسئلہ بن چکا ہے نہ کہ ریاستی مسئلہ رہا۔ ۱۸۵۷ء میں سقوط دہلی ہوا اور ہندوستان سے ساڑھے چھ سو سالہ مسلم سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ اور برٹش گورنمنٹ کے ذریعہ پورے ملک میں ایک سیکولر تعلیم رائج کی گئی۔ معروف انگریز مؤرخ اور سیاست داں، بی ٹی لارڈ میکالے (۱۸۰۰-۱۸۵۹ء) کی کوششوں سے ۱۹۳۸ء میں انگریزی زبان کو فارسی کی جگہ سرکاری زبان ہونے کا درجہ دے دیا گیا اور ۱۹۴۷ء میں ملک ایک سیکولر اسٹیٹ میں تبدیل ہو گیا۔ ہندوستان میں مذہبی تعلیم کس نہج پر دی جائے یہ ایک اہم سوال ہے، اس سلسلے میں ہمارا نقطۂ نظر یہ ہے کہ مذہبی تعلیم کا مقصد ایک خدا پرست انسان کے ساتھ ملک کا ایک اچھا شہری بنانا بھی ہے۔ مذہبی تعلیم کے دائرہ کو اس قدر وسعت ملنی چاہیے کہ مدارس سے فارغ ہونے والے طلبہ مذہب کی خدمت کے ساتھ ملک کی خدمت کے بھی قابل ہو سکیں۔ مذہبی تعلیم کے مراکز میں عربی جامعات، دارالعلوم، مدارس اور خانقاہیں سرفہرست ہیں۔ ان اداروں نے ہر عہد میں ضرورتوں کے مطابق اپنے نصاب تعلیم اور نظام تعلیم کو ڈھالنے کی کوششیں کیں۔ مذہبی تعلیم میں اصلاح کا

یہ جزوی عمل کبھی موقوف نہیں ہوا۔ یہ آج بھی جاری ہے اور مدارس کے دانشوروں کو مزید اس پہلو پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ کس طرح مذہبی تعلیم کو ایک پر کشش تعلیم کی صورت میں پیش کیا جاسکتا ہے تاکہ مذہب کے خلاف اٹھنے والی آواز کو عقلی اور سائنٹفک طریقۂ استدلال سے خاموش کیا جاسکے۔ درس نظامی کے تحت آج کے مدارس میں دی جانے والی مذہبی تعلیم، فکر میں ''اصالت'' اور پیش کش میں ''عصریت'' کا تقاضا کرتی ہے۔ وہ تقاضا یہ ہے کہ استدلال کا اسلوب سائنٹفک ہو۔ مذہبی تعلیم کے اندر اتنی وسعت پیدا کی جائے کہ مذہب کے خلاف اٹھنے والے جدید چیلنج کا اطمینان بخش جواب دیا جاسکے۔ نت نئے مسائل کے حل کے لیے طلبہ کے ذہن کو تیار کیا جائے۔ اس کے لیے ہمیں اپنے نصاب کی تجدید واصلاح حسب ذیل طریقے سے کرنا چاہیے۔

جدید علم کلام(Modern Theology):

زمانہ قدیم سے ہی مذہب کے دائرے میں یہ کوشش کی جاتی رہی ہے کہ مذہبی افکار و نظریات کو عقلی سطح پر بھی قابل فہم بنایا جائے۔ مذہب میں چونکہ خدا کے تصور کو مرکزی حیثیت حاصل ہے اس لیے فطری طور پر بڑے بڑے دماغ اس میں مصروف رہے کہ وہ عقلی دلائل کی بنیاد پر خدا کے وجود کو ثابت کریں۔ مذہب اور عقلیات کی یہ کہانی فلاسفہ (philosophers) سے شروع ہوتی ہے۔ دنیا کے اعلی ترین دماغ اس غور وفکر میں مشغول رہے کہ وہ خدا کے تصور اور اس کے وجود کو اعلی تعقُّل کی سطح پر قابل فہم بنائیں، لیکن وہ سب کے سب اس مقصد میں ناکام رہے اس کا سبب یہ تھا کہ ان فلسفیوں کے پاس غور وفکر کرنے کا جو فریم ورک تھا وہ محدود تھا مثال کے طور پر تمام فلاسفہ کا مشترکہ ذہن یہ تھا کہ وہ اعلی حقیقت کو ایک غیر حقیقی وجود تصور کرتے تھے ،اس بنا پر انہوں نے خدا کو عالمی روح(world spirit) یا عالمی تصور(world idea) جیسا نام دیا۔ مثلا برکلے ،کانٹ اور ہیگل وغیرہ۔ اس تصور کے تحت وہ فلسفیانہ فکر پیدا ہوئی جسے آئڈیل ازم(idealism) کہا جاتا ہے۔ فلسفیانہ الہیات کا دوسرا نام آئڈیل ازم ہے ۔ساتویں صدی عیسوی میں اسلام کا

دور آیا۔ عہد عباسی میں ایک نیا علم مدون ہوا جسے علم کلام (theology) کہا گیا۔ جو لوگ اس علم میں مشغول ہوئے وہ متکلّمین کے نام سے مشہور ہوئے۔ متکلّمین اسلام نے از سر نو یہ کوشش کی کہ وہ مذہبی عقیدہ یا خدائی تصور کو عقل کی اصطلاحوں میں بیان کریں، لیکن ان کی کمزوری یہ تھی کہ فریم ورک کے نام سے ان کے یہاں جو چیز موجود تھی وہ دوبارہ یونانی منطق (Greeklogic) تھی۔ ان کے استدلال کی بنیادیں فلسفیانہ طرز فکر پر مبنی تھیں۔ یونانی منطق دراصل قیاسی منطق (syllogism) کا دوسرا نام ہے۔ یہ منطق کا وہ طریقہ ہے جو سائنسی منطق کے ظہور میں آنے سے پہلے استعمال ہوتا تھا۔ مسلم متکلّمین کے پاس دلیل قائم کرنے کے لئے یہی قدیم منطق قابل حصول تھی۔ اٹھارہویں صدی میں مغرب کے زیر اثر ظہور میں آنے والے سائنسی وصنعتی انقلاب نے دنیا کو تعقل پسندی کے ایک نئے دور میں داخل کر دیا، رفتہ رفتہ تعقل پسندی کا یہ رجحان اتنا غالب ہوا کہ اب انسان ہر واقعہ کی مادی اور عقلی توجیہ کا خوگر ہو گیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ منطقِ یونانی، تعقل پسند انسانوں کو مطمئن کرنے کے لئے ناکافی ثابت ہونے لگی۔ اس کے بعد انیسویں اور بیسویں صدی میں جدید سائنس کے عروج کا زمانہ آیا۔ اس عہد میں فطرت میں چھپے ہوئے نئے حقائق دریافت ہوئے، ان حقائق نے تاریخ میں پہلی بار وہ علمی بنیاد فراہم کی جس کی بنیاد پر الٰہیات کو از سر نو ”سائنسی الٰہیات“ کے طور پر مرتب کیا جا سکے۔ سائنسی الٰہیات کے ظہور نے اس بات کو آخری حد تک ممکن بنا دیا کہ خدا پرستانہ عقائد کو خود اس علمی معیار پر مدون کیا جا سکے جس کو ان کے نزدیک آخری مسلمہ عقلی معیار کی حیثیت حاصل ہو چکی ہے، مگر عجیب بات یہ ہے کہ یہ جدید سائنسی امکان اپنی اعلیٰ ترین صورت میں سامنے آیا لیکن اس کو الٰہیات کے شعبے میں استعمال نہیں کیا جا سکا۔

جدید سائنس کے حصول کے بعد علم کے ہر شعبے میں انقلاب آیا اور کوشش یہ ہوئی کہ علوم کو جدید سائنسی معیار پر ڈیولپ کیا جائے۔ علم خلیات (cytology) سے لے کر علم فلکیات (Astronomy) تک بے شمار شعبہ ہائے علم کو سائنسی ترقی کا درجہ ملا، لیکن الٰہیات کا علم سائنسی بنیادوں پر تدوین جدید کے حوالے سے ایک مستثنیٰ علم بنا رہا۔

جدید سائنس جدید علم کلام کی اساس:

اگر سیدھے لفظوں میں یہ کہا جائے کہ قدیم علم کلام کے استدلال کی بنیاد فلسفۂ قدیمہ اور منطقِ یونانی پر قائم تھی اور جدید علم کلام کے طریقۂ استدلال کی بنیاد جدید سائنس پر قائم ہے تو یہ ایک انتہائی منصفانہ بات ہوگی۔ قدیم علم کلام کے طرز استدلال کی عمارت منطقیانہ طرز فکر پر قائم تھی تو جدید علم کلام کے طریقۂ استدلال کی اساس جدید سائنس پر قائم ہونی چاہیے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سائنس دانوں کے بہت سے نظریات سے اہل اسلام کو اختلاف رہا ہے اور اب بھی ہے اس کے بعض نظریات وہ ہیں جو نصوص قرآنی کی صریح مخالفت کرتے ہیں۔ مثلا: نظریۂ حرکت زمین، انکار وجود آسمان، مشہور برٹش عالم طبیعیات چارلس ڈارون (Charles Daruein) (ولادت ۱۸۰۹ء وفات ۱۸۸۲ء) کا پیش کردہ حیاتیاتی ارتقا کا نظریہ۔ جس کا ماحصل یہ تھا کہ انسان جانور سے ترقی کرتے کرتے موجودہ حالت کو پہونچا۔ دو سو سال سے یہ نظریہ یورپ پر چھایا رہا۔ یہ نظریہ مکمل طور پر قیاس مع الفارق پر مبنی ہے جس کا بطلان اظہر من الشمس ہے۔ اس نظریہ نے انسان کو بندر کی ترقی یافتہ شکل قرار دیا جو انسانیت کی کھلی ہوئی توہین اور تذلیل ہے۔ اب سائنس دانوں کے یہاں بھی اس کا یہ نظریہ قابل رد ہو چکا ہے سائنس داں ایک طرف کہتے ہیں ہماری تحقیق کی بنیاد مشاہدات اور تجربات پر ہے مگر یہاں سراسر ظن وتخمین ہے۔ کس نے انسانوں کو جانور سے ترقی کرتے ہوئے دیکھا؟ اس کے برعکس اللہ تعالی کا فرمان ہے: **لقد خلقنا الانسان من سللة من طين**۔ ہم نے انسان کو (یعنی انسان اول کو) کشید کی ہوئی مٹی سے پیدا کیا۔ (۱) سورۂ تین میں فرمایا: **لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ** (سورۂ تین، آیت ۳)۔ ہم نے انسان کو سب سے خوبصورت پیکر میں پیدا کیا۔ نظریہ بگ بینگ (Big Bang Theory) سائنس دانوں کا یہ ماننا کہ تقریبا ۱۳ بلین سال پہلے خلا میں ایک انفجار (Explosion) ہوا اور اس کے

---

(۱) سورۃ المومنون پ ۱۸

نتیجے میں یہ موجودہ کائنات از خود وجود میں آئی۔ جب کہ اللہ تعالی فرماتا ہے: ان ربکم اللہ الذی خلق السمٰوٰت والارض فی ستۃ ایام (۱)۔ بیشک تمھارا رب وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا فرمایا۔

پھر آسمان کی ابتدائی کیفیت کے بارے میں فرمایا کہ وہ دھواں کی شکل میں تھا: ثم استوی الی السماء و ھی دخان فقال لھا و للارض ائتیا طوعا او کرھا قالتا اتینا طائعین۔ فقضھن سبع سمٰوٰت فی یومین و اوحی فی کل سماء امرھا و زینا السماء الدنیا بمصابیح و حفظا ذلک تقدیر العزیز العلیم[2]۔ پھر آسمان کی طرف قصد فرمایا اور وہ دھواں تھا تو اس سے اور زمین سے فرمایا دونوں حاضر ہو خوشی سے چاہے ناخوشی سے۔ دونوں نے عرض کی ہم رغبت کے ساتھ حاضر ہوئے تو انھیں پورے سات آسمان کر دیا دو دن میں، اور ہر آسمان میں اسی کے کام کے احکام بھیجے۔ اور ہم نے نیچے کے آسمان کو چراغوں سے آراستہ کر دیا اور نگہبانی کے لیے یہ اس عزت والے علم والے کا ٹھہرایا ہوا ہے۔

اس طرح کے اور بھی نظریات ہیں جن سے اتفاق کرنا ممکن نہیں جب تک کہ صحیح تطبیق کے ذریعے یہ نظریات، موافق اسلام نہ بن جائیں۔ تاہم کلی طور پر سائنس کو رد کر دینا کسی بھی طرح درست نہیں۔ اس کی بہت سی تحقیقات نے فلسفۂ اسلامی کو عقلی سطح پر سمجھانا آسان کر دیا ہے۔

یہ بالواسطہ طور پر جدید علم کلام کا ظہور ہے۔ اب تک نقلی بنیادوں پر مذہب اور عقائد مذہب کی توجیہ کی جاتی رہی لیکن جدید سائنس نے اس کو ممکن بنایا کہ اب عقلی و سائنسی بنیادوں پر بھی خدا اور مذہب کی توجیہ ممکن ہے۔

---

(۱) اعراف، ۵۴

(۲) حم سجدہ آیت ۱۱، ۱۰

نظریۂ توحید کے حق میں سائنسی اساس:

سر آئزک نیوٹن (وفات 1727ء) کے زمانے سے یہ سمجھا جاتا رہا ہے کہ چار بنیادی طاقتیں (Forces) ہیں جو پوری کائنات کو کنٹرول کرتی ہیں۔ یہ نظریہ اٹھارہویں صدی سے بیسویں صدی کے نصف تک دنیا پر چھایا رہا۔ مشہور جرمن سائنٹسٹ، البرٹ آئن اسٹائن (وفات، 1955ء) نے اس تعداد کو گھٹانا چاہا لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہوسکا۔ ڈاکٹر عبدالسلام احمدی (1926-1996ء)، شیلڈن گلیشو (Sheldon Glashow) اور اسٹون وائن برگ (Steven Weingberg) تینوں نوبل انعام یافتہ سائنس دانوں نے ۱۹۷۹ء میں خالص ریاضیاتی بنیاد پر یہ ثابت کیا کہ کائنات کو کنٹرول کرنے والی طاقتیں چار نہیں بلکہ تین ہیں۔ اس تحقیق پر ان کو فزیکس کا نوبل پرائز دیا گیا۔

بعد کو نظریاتی فزیکس کے مشہور برٹش سائنس داں اسٹفن ہاکنگ (1942-2018ء) نے اس تعداد کو مزید گھٹا دیا اور یہ ثابت کیا کہ کائنات کو کنٹرول کرنے والی طاقت صرف ایک ہے اس طاقت کو انہوں نے واحد ڈور تھیوری (single string theory) کا نام دیا ہے۔(۱)

اس طرح خالص سائنٹفک ریسرچ کے ذریعہ یہ ثابت کرنا ممکن ہوا کہ ایک ہی وجود ہے جو اس کائنات کا نظم کر رہا ہے اور یہ نظریۂ توحید کا سائنسی اعتراف ہے، جو اسلام کے حق میں سائنسی اساس فراہم کر رہا ہے۔

اسی طرح مشہور سائنٹسٹ سر جیمز جینز (۱۸۷۷-۱۹۴۶ء) Sir James Jeans نے ڈاکٹر عبدالسلام ہی کی طرح الٰہیات کے موضوع پر کچھ جزئی کام کیا۔ انھوں نے اپنی کتاب (The Mysterious Universe -1930) میں خالص سائنسی تجزیہ (Scientific analysis) کے ذریعہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ کائنات اتنی زیادہ

(1) Izhar-e-Deen (Urdu) Maulana Wahiduddin Khan, First Published 2014. Good Word Books, New Delhi.

بامعنی ہے کہ وہ الل ٹپ (Atrandom) طور پر وجود میں نہیں آسکتی۔ یقیناوہ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت وجود میں آئی ہے۔ سر جیمز نے لکھا ہے کہ کائنات کا خالق ایک ریاضیاتی ذہن (Mathematical mind) معلوم ہوتا ہے۔ اہل اسلام اس ریاضیاتی ذہن کی تعبیر خدا کی ذات سے کرتے ہیں۔

قدیم سائنسی نظریہ شرکیہ عقیدے کی موافقت کر رہا تھا لیکن سائنس داں اس قسم کے چار نظریے پر مطمئن نہ تھے۔ ان کو نظر آتا تھا کہ کائنات میں بہت زیادہ ہم آہنگی ہے ایسی ہم آہنگ اور مربوط کائنات میں چار طاقتوں کا نظریہ بے جوڑ نظر آتا تھا، چنانچہ سائنس دانوں کی تحقیق جاری رہی یہاں تک کہ ثابت ہوگیا کہ کائنات کو کنٹرول کرنے والی طاقت صرف ایک ہے۔ اس جدید سائنسی دریافت نے شرک (Polytheism) کے نظریے کا علمی طور پر خاتمہ کر دیا اب علم اور عقل کی بنیاد، صرف توحید کے نظریے کو حاصل ہے۔

اب غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ سائنس دانوں کا یہ اعتراف کہ اس کائنات کو ایک طاقت کنٹرول کر رہی ہے یہی قرآن کا علم کلام ہے۔ جس بات کو سائنس دانوں نے ریاضیاتی اصولوں اور کائنات میں جاری طبیعی قانون کے تحت بیان کیا ہے اس کو قرآن نے اپنے سادہ اسلوب میں بیان کیا ہے۔ اللہ کا ارشاد ہے لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا اگر آسمان اور زمین کو کنٹرول کرنے والی طاقتیں متعدّد ہوتیں تو آسمان و زمین کا نظام بگڑ جاتا۔ اور اس فساد کے نتیجے میں تباہی رونما ہوتی۔ ایک طاقت یہ چاہتی کہ سورج کو مغرب سے نکالیں اور دوسری یہ چاہتی کہ سورج کو مشرق سے طلوع کریں۔

فقہ اسلامی کی تشکیل جدید: فقہ اسلامی (Islamic Jurisprudence) دین اسلام کے قوانین کے علم کا نام ہے۔ اس باب میں سیدنا امام اعظم ابوحنیفہ (متوفی: ۱۵۰ھ) نے دوسری صدی ہجری میں اس علم کو مدون فرماکر باضابطہ ایک سبجیکٹ بنادیا۔ قرآن واحادیث سے ہزارہاہزار مسائل استنباط فرماکر اسلامی علم قانون کی ہمہ گیریت کو دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اسلامی قانون کے اندر اللہ تعالی نے وہ خصوصیت اور لچک رکھی ہے جو دنیا کے بدلتے حالات

اور تقاضوں کے مطابق خود کو منطبق کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

فقہ اسلامی کے نام پر جو کتابیں آج ہمارے مذہبی نصاب درس میں شامل ہیں وہ سب عہد اسلامی میں لکھی گئی ہیں۔ آج دنیا میں ہر جگہ یا تو جمہوری حکومتیں قائم ہو چکی ہیں یا غیر اسلامی شاہی نظام قائم ہے۔ آج کا دور باندی اور غلام کا دور نہیں رہا۔ بلکہ ہر قوم مکمل طور پر آزاد ہے۔ اٹھارہویں صدی سے اکیسویں صدی تک جدید سائنسی وصنعتی انقلاب کے نتیجے میں ہزاروں جدید مسائل ایسے سامنے آچکے ہیں جو اس سے پہلے نہیں آئے تھے۔

مگر یہ مسائل جو حالات حاضرہ کے بطن سے پیدا ہوئے آج تک ہماری فقہی کتابوں کا حصہ نہ بن سکے۔ ایسا نہیں ہے کہ فقہاے امت نے ان مسائل کا کوئی حل نہیں نکالا ان تمام نو پیدا مسائل پر انھوں نے تحقیقی و سائنسی طریقے سے غور وفکر کیا اور بڑی دیدہ بینی و عرق ریزی سے ان مسائل کے احکام کا استنباط کیا۔ مثال کے طور پر شمالی ہند کی عظیم مذہبی درسگاہ ،الجامعۃ الاشرفیہ، مبارک پور نے ۱۹۹۳ء سے ۲۰۱۸ء تک ۲۶ فقہی سیمیناروں میں حالات حاضرہ کے بطن سے پیدا ہونے والے جدید مسائل پر فقہاے اسلام کے ایک عظیم فقہی بورڈ ''مجلس شرعی'' کے ذریعے تقریباً ۷۵ مسائل پر فیصلے کیے ہیں، جو بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان فیصلوں کی روشنی میں روزمرہ زندگی سے متعلق سینکڑوں مسائل حل ہو جاتے ہیں۔ ۱۹۹۳ء سے ۲۰۱۳ء تک کے سیمیناروں کے فیصلے ناظم مجلس شرعی، محقق مسائل جدیدہ حضرت مفتی محمد نظام الدین رضوی، دامت برکاتہم، صدرالمدرسین و صدر شعبۂ افتا، الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور کی ترتیب و تدوین کے ساتھ مجلس شرعی مبارک پور سے تین جلدوں میں شائع ہو چکے ہیں، جن میں سرفہرست درج ذیل مسائل ہیں۔ ۱۔ مشترکہ سرمایہ کمپنی کا نظامِ کار اور اس کی شرعی حیثیت، ۲۔ دیہات میں جمعہ وظہر جائز ہے یا نہیں؟ ۳۔ فلیٹوں کی خرید وفروخت کے جدید طریقے اور ان کے احکام، ۴۔ مصنوعی سیارہ (سٹیلائٹ سے) رویت ہلال کا حکم، ۵۔ نیٹورک مارکیٹنگ کی شرعی حیثیت، ۶۔ میوچول فنڈ کے ذریعہ کمپنیوں میں کاروبار، ۷۔ لائف انشورنس، ۸۔ شیر بازار کے مسائل، ۹۔ چلتی ٹرین پر نماز، ۱۰۔ ڈی این اے ٹیسٹ اسلامی

نقطۂ نظر سے، ۱۱۔ جدید بینک کاری کے مسائل وغیرہ۔ اس طرح کے سینکڑوں مسائل ہیں جو اس عہد کی پیداوار ہیں جن کو ہمارے فقہا نے اپنی خداداد صلاحیتوں سے حل کر دیا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان کو طلبہ کے لیے نصاب درس کا حصہ بنایا جائے اور قضایا فقہیہ ''معاصرہ'' کے نام سے ایسی کتاب لکھی جائے جو اس ضرورت کو پوری کر دے۔ فقہی کتابوں میں ان بحثوں کا اضافہ کیا جائے کہ ایک سیکولر اور جمہوری ملک میں رہنے سے مسائل کی نوعیت پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

تاریخ اسلام کی تدوین جدید: تاریخ اسلام کے نام پر اردو زبان اور تقریباً عربی و فارسی زبانوں میں بھی جتنی کتابیں آج تک لکھی گئی ہیں ان سب میں ایک مشترکہ خامی یہ رہی ہے کہ ان میں تاریخ کا مرکز و محور حکومتیں اور سلاطین و امرا رہے ہیں، جب کہ اس کا مرکز اسلام ہونا چاہیے۔ اب اسلام کی اشاعت میں، دعوت و تبلیغ میں، اسلامی علوم و فنون کے فروغ اور اسلامی تہذیب و ثقافت کو پروان چڑھانے میں جن لوگوں نے بھی مرکزی کردار ادا کیا ہے خواہ وہ خلفا و سلاطین ہوں یا علما و فقہا یا صوفیہ و متکلّمین ہر ایک کو اس میں جگہ ملنی چاہیے تھی، مگر یہ عجیب بات ہے کہ اس میں اسلام، دعوت اسلام اور داعیان امت کی تاریخ برائے نام ہے جب کہ سلاطین و امرا کی تاریخ کا مکمل غلبہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ اگر کوئی غیر مسلم شخص اس تاریخ اسلام کو پڑھ کر اسلام کو سمجھنا چاہے تو اسے سخت غلط فہمی ہو سکتی ہے، کیوں کہ بادشاہوں کے قتل و قتال، جنگ و جدال، حکومت و اقتدار اور ذاتی و نفسانی خواہشات کے زیر اثر لڑی جانے والی جنگوں کو بھی ہم نے تاریخ اسلام کا ایک حصہ بنا دیا۔ بجا طور پر یہ کتابیں اس قابل ہیں کہ ان کو تاریخ مسلمین کہا جائے، تاریخ سلاطین کہا جائے، نہ کہ تاریخِ اسلام۔ تاریخ اسلام کے ضمن میں درج ذیل موضوعات پر مختصر اور جامع انداز میں ایک ایک چیپٹر شامل کیا جائے: اسلام کا آئینی نظام، اسلام کا عدالتی نظام، اسلام کا مالیاتی نظام، اسلام کا جنگی و دفاعی نظام، اسلام کا بلدیاتی نظام، اسلام کا تعلیمی نظام، اسلام میں اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ، اسلام کا تصور امن، سائنسی علوم کے فروغ میں اسلام اور مسلمانوں کا حصہ۔

قرآن مجید کا سائنسی مطالعہ: نصاب درس میں چلائی جانے والی تفسیر بیضاوی ہو یا مدارک التنزیل یا جلالین شریف یا کوئی اور کتاب یہ تمام تفسیریں قدیم، روایتی اور کلاسیکل تفاسیر کے نمونے ہیں جو قدیم طرز اسلوب پر مبنی ہیں۔ قرآن کریم کے مطالعہ کے دو طریقے ہیں۔ ایک طریقہ روایتی اور کلاسیکی ہے۔ جس میں لغت، نحو وصرف، شان نزول، وجوہ بلاغت اور استنباط مسائل پر زور دیا جاتا ہے مثلاً امام آلوسی کی روح المعانی اور علامہ ابوحیان اندلسی کی تفسیر البحر المحیط، زمخشری کی کشاف اور امام نسفی کی مدارک التنزیل اس کی بہترین مثالیں ہیں۔

دوسرا طریقہ جدید، اکیڈمک اور سائنٹفک ہے اس طریقۂ مطالعہ میں قرآن مجید کی درج بالا خوبیوں کو باقی رکھتے ہوئے اس کے پورے مضمون کا سائنسی مطالعہ کیا جاتا ہے۔ اور اس کے اندر قدرت کی چھپی ہوئی نشانیوں کا پتہ لگایا جاتا ہے اور ہر قانون اسلام کی ایک عقلی توجیہ بھی کی جاتی ہے تاکہ تعقل پسند افراد جب قرآن کو پڑھیں تو عقلی سطح پر قرآن کے اعجاز کا اعتراف کر سکیں۔ اس طرح کی تفسیریں عالم اسلام میں بہت کم لکھی گئی ہیں۔ مصری عالم دین علامہ طنطاوی کی الجواہر فی تفسیر القرآن الکریم اس کی ایک عمدہ مثال ہے۔ جزوی طور پر اور بھی لوگوں نے کسی سورہ یا چند آیات کی سائنسی وعقلی توجیہ پیش کی مگر پورے قرآن کی سائنسی تفسیر شیخ طنطاوی جوہری کی خصوصیت ہے یہ تفسیر انھوں نے بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں مکمل کی ہے جو پندرہ جلدوں میں مصر سے شائع ہو چکی ہے۔

آج علمی دنیا میں انفجار (Explosion) کے بعد جو سائنسی، تمدنی اور صنعتی انقلاب ظہور میں آیا ہے اس نے قدرت کے رازہائے سربستہ کو آشکار کر دیا ہے۔ لگتا ہے یہ عہد خود قرآن کی تفسیر کر رہا ہے۔ اور بعض آیات قرآنیہ وہ ہیں جن کے درست معانی عصر حاضر سے ربط جوڑے بغیر سمجھ میں نہیں آتے چوں کہ قدیم مفسرین کے نزدیک وہ نشانیاں ابھی ظہور میں نہیں آئی تھیں تو انھوں نے اپنے عہد کے مطابق اس کی تفسیر کی۔ اب وہ ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں لہذا اہم پر ضروری ہے کہ آیات قرآنیہ سے ہم وہ معانی اخذ کریں جو عصر حاضر کا تقاضا ہے تاکہ خدائی کتاب پر ہمارا یقین اور مضبوط ہو۔ چند مثالوں سے اس ادعا کی وضاحت ممکن

ہے۔

۱۔ سورۂ تکویر میں اللہ تعالیٰ قربِ قیامت کی نشانیاں بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے وَاِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ(۱) اور جب سمندر سلگائے جائیں۔ اس آیت کا ایک قدیم معنی یہ ہے کہ قیامت کے وقوع سے پہلے ایسا ہوگا کہ سمندر کا پانی سلگایا جائے گا اور وہ بھاپ بن کر اڑ جائے گا۔ مگر عصر جدید نے اس کا ایک اور معنی بیان کیا کہ قیامت سے پہلے ٹکنالوجی اس حد تک ترقی کر جائے گی کہ انسان سمندر کے پانی سے بجلی تیار کرے گا اور اس طرح سمندر کو سلگایا جائے گا بطور مجاز ہم یہ معنی بھی مراد لے سکتے ہیں اور بعیدِ مجاز کے طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ زیر زمین جو پٹرول کا سمندر ہے وہ ظاہر ہوگا اور انسان اس کو بطور ایندھن استعمال کرے گا۔ یہ ہے وَ اِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ کی سائنسی تفسیر۔ اس آیت کی ایک تیسری توجیح یہ ہے کہ سمندر جس سطح پر واقع ہیں، ان کے نیچے آگ کے آتش فشاں پہاڑ دھک رہے ہیں، قربِ قیامت میں آگ کا پہاڑ اس سمندر سے ظاہر ہو جائے گا، جسے اس وقت پانی سے چھپا دیا گیا ہے اور سمندر کا پانی پیٹرول کی طرح کھولتا چلا جائے گا۔

۲۔ **قرآن سے بلیک ہول کا ثبوت:** مشہور برطانوی سائنٹسٹ اسٹفن ہاکنگ (۱۹۴۲ء۔۲۰۱۸) نے ایک خوفناک انکشاف کیا کہ خلا میں اب تک کا سب سے بڑا بلیک ہول (Black hole) ظاہر ہوا ہے اور یہ سیاہ شگاف اتنا بڑا ہے کہ وہ ہمارے پورے نظام شمسی کو اپنے اندر جذب کر سکتا ہے۔ نظام شمسی (Solar System) کا دائرہ کتنا بڑا ہے اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ اس نظام کا بعید ترین سیارہ پلوٹو (Pluto) ہے جو سورج کے گرد بیضوی دائرے میں چکر لگا رہا ہے۔ یہ دائرہ ساڑھے سات بلین (ارب) میل پر مشتمل ہے۔ اس کا حجم ۶ بلین سورج سے بھی زیادہ ہے۔ یہ بلیک ہول ہماری کہکشاں (Milky Way)

(۱) تکویر، آیت ۶

سے ۵۰ ملین سال نور کی دوری پر واقع ہے۔(۱) اور اس سال نور کی وسعت کا اندازہ اس سے لگا سکتے ہیں کہ روشنی کی رفتار فی سکینڈ ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل (۱،۸۶،۰۰۰) ہے پھر اس سکینڈ، منٹ اور گھنٹوں سے جو سال تیار ہوگا اسے نوری سال کہتے ہیں۔ یہ ایسی حقیقت تھی کہ جس کا ذکر قرآن نے اپنے سادہ اسلوب میں اس طرح کیا تھا۔ **اذا السماء انفطرت و اذا الکواکب انتثرت**[2] جب آسمان پھٹ جائے گا اور ستارے جھڑ پڑیں گے۔ اسی حقیقت کو سورۂ انشقاق کی پہلی آیت میں اس طرح بیان کیا گیا **إِذَا السَّمَاءُ انْشَقَّتْ**(۳) جب آسمان پھٹ جائے گا۔ یعنی اس کے اندر hole پیدا ہوجائے گا۔ اور بڑے بڑے اَجرام فلکی قرب قیامت میں ٹوٹ پھوٹ کر، جھڑ کر ایک ایسی دنیا کا حصہ بن جائیں گے جسے آج کی اصطلاح میں بلیک ہول کہا جاتا ہے۔ یہاں انشقاق سما سے بلیک ہول ہم نے مجازی طور پر مراد لیا ہے اس کا حقیقی معنی اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

اس طرح کی بے شمار آیات ہیں جن کی عصری و سائنسی تفسیر پیش کی جاسکتی ہے۔ اس طریق مطالعہ سے انفس و آفاق کے اندر غور و فکر کا رجحان قوی ہوگا۔ آج کم از کم تفسیر کی کوئی ایک کتاب ایسی لکھ کر شامل نصاب ضرور کرنی چاہیے جس سے قرآنی سائنسی مطالعے کا ذوق پیدا ہو۔ (۴)

مدارس اسلامیہ کے نصاب میں عصری علوم کی شمولیت:

مدارس اسلامیہ کے فارغ طلبہ کے بارے میں اسکول اور کالج سے وابستہ لوگوں کی طرف سے یہ بات بار بار دہرائی جاتی ہے کہ مدارس سے جو علما فارغ ہوتے ہیں وہ فقط دینی علوم

---

(1) Izhar-e-Deen (Urdu) Maulana Wahiduddin Khan, First Published 2014. Good Word Books, New Delhi.

(۲) سورۃ الانفطار، آیت: ۲،۱

(۳) سورۃ الانشقاق، آیت نمبر ا

(۴) ابن اَبی اَصیبعہ، عیون الانباء فی طبقات الاَطباء، ج اول

کے ماہر ہوتے ہیں، سائنس، ریاضی، فلسفۂ جدیدہ اور دیگر طبیعی علوم کے بارے میں ان کی واقفیت ادنی درجے میں یا نہ کے برابر ہوتی ہے، جب کہ عہد وسطی کی تاریخ میں انھیں مدارس سے متکلّمین، فقہا و محدثین کے ساتھ ساتھ ماہرین ہیئت و فلکیات، فزکس، کیمسٹری، ریاضی اور جغرافیہ و تاریخ کے ماہرین پیدا ہوا کرتے تھے۔ اس طرح کے سوالوں کا بار بار جواب بھی دیا گیا، لیکن اس جگہ ہمیں یہ عرض کرنا ہے کہ جس طرح آپ مدارس سے علوم جدیدہ میں کامل مہارت کی توقع رکھتے ہیں ویسے ہی ہمارا آپ سے یہ مطالبہ ہے کہ آپ اسکول، یونیورسٹیز اور کالجوں سے دینی علوم کے ماہرین، فقہا، محدثین اور متکلّمین کی جماعت کیوں نہیں فارغ کرتے؟ ان کی رسائی فقط علوم جدیدہ تک کیوں ہوتی ہے؟ ظاہر سی بات ہے کہ اس کا جواب نفی میں ہوگا، کیوں کہ دونوں اداروں کے قیام کے مقاصد ہم نے خود جدا کر رکھے ہیں۔ یونیورسٹی اور کالج سے وابستہ لوگ دینی علوم میں رغبت نہیں رکھتے اور دینی اداروں سے وابستہ حضرات عصری علوم سے ناواقف رہ جاتے ہیں۔ مسلم دور حکومت میں سرکاری سطح پر تعلیم کا نظم اس طرح تھا کہ ثانویہ سطح (انٹر) تک کی تعلیم سارے لوگوں کے لیے یکساں ہوا کرتی تھی۔ جس میں دینیات، عربی زبان و ادب، نحو و صرف، فلسفہ، ہیئت و فلکیات، ریاضی، کیمسٹری اور فزیکس وغیرہ کی تعلیم دی جاتی تھی پھر اس کے بعد کسی بھی فن میں اختصاصی تعلیم کا نظم تھا۔ آج بھی سرکاری سطح پر جو تعلیم دی جاتی ہے ثانویہ تک کے مرحلے میں اس بات کا خاص خیال رکھا گیا ہے کہ وقت کے ضروری علوم سے طلبہ کو روشناس کرا دیا جائے۔ قوم مسلم کے ۹۸/ فیصد بچے اسکولوں اور کالجوں میں جاتے ہیں صرف ۲/ فیصد مدارس میں آتے ہیں ان میں بھی ۹۰/ فیصد طلبہ کا تعلق غریب گھرانوں سے ہوتا ہے وہ اس قابل نہیں ہوتے کہ مہنگی فیس کے ساتھ اسکولوں میں تعلیم حاصل کر سکیں۔

اب مدارس ایسے طلبہ پر محنت صرف کر کے ان کو تعلیم یافتہ اور ملک کا اچھا شہری بنانے کا کام کرتے ہیں اب دینی علوم کے نام پر اس دو فیصد کو بھی عصری علوم میں الجھا دیا جائے تو پھر دین کا اللہ ہی حافظ ہے۔ بڑی معذرت کے ساتھ عصری دانش گاہوں کے اصلاح

پسند طبقہ سے درخواست ہے کہ وہ ۹۸٪ فیصد طلبہ کے لیے اپنے ذوق کے مطابق عصری علوم کے اسکول قائم کریں اور ان کو ڈاکٹرز، انجینئرز، سیاست داں اور سائنس داں بنائیں، اور ان کے اندر دینی خدمت کا جذبہ بھی پیدا کریں تو یہ وقت کی بہت بڑی ضرورت کو پورا کرنا سمجھا جائے گا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مذہبی تعلیم کے ساتھ ان علوم کا انضمام کس قدر اور کس طرح ہونا چاہیے کہ ایک عالم دین زمانے کے مقتضیات کو اچھی طرح پورا کرسکے۔ یہ ایک قابل غور مسئلہ ہے۔ ان عصری علوم کا انضمام اتنی ہی مقدار میں ہونا چاہیے کہ جس سے دینی علوم کے مضامین متاثر نہ ہوں اور یہ انضمام اس طرح ہونا چاہیے کہ یہ دینی علوم کی ضرورت بن کر دینی مضامین کے نصاب میں جذب ہو جائیں۔ خاص بات یہ کہ دونوں مضامین کے درمیان جو گہرا تعلق اور معنوی رشتہ قائم ہے اسے بھی صراحت کے ساتھ بیان کیا جائے۔

علم ریاضی: اسے درجۂ اعدادیہ سے درجۂ رابعہ تک شامل نصاب ہونا چاہیے اور الجبرا و جیومیٹری تک کی تعلیم ہر حال میں دی جانی چاہیے۔

ہندی زبان: اسے درجۂ اعدادیہ سے درجۂ اولی تک شامل نصاب ہونا چاہیے۔

انگریزی زبان وادب: اسے درجۂ اولی سے درجۂ فضیلت تک شامل نصاب ہونا چاہیے۔

جغرافیہ وسائنس: اسے درجۂ اعدادیہ سے درجۂ رابعہ تک شامل نصاب کیا جائے۔

ہیئت وفلکیات اور توقیت: انھیں درجۂ رابعہ سے درجۂ سادسہ تک شامل نصاب رکھا جائے۔ ان علوم کی تدریس باضابطہ لیب کی مدد سے ہونی چاہیے۔ ان کے تین یونٹ بنائے جائیں۔ ان تینوں علوم کو پڑھانے کے لیے جدید طرز پر لکھی جانے والی کتابوں سے مدد لی جائے۔ اور تدریس میں قوت سمعیہ وبصریہ دونوں کا استعمال یکساں طور پر کیا جائے۔

ہم نے ابتدائی چار پانچ سالوں میں علوم جدیدہ کی تحصیل پر اس لیے زور دیا کہ اس کے بعد کے چار سال محض دینی علوم میں اختصاص پیدا کرنے کے لیے رہ جائیں۔

الحمد للہ ہمارے جامعہ اشرفیہ، مبارک پور، اعظم گڑھ نے عصر حاضر کے تقاضے کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے جامع نصاب میں ہیئت وفلکیات کو چھوڑ کر مذکورہ تمام مضامین کا احاطہ

کر رکھا ہے۔ جامعہ نے اپنے نصاب تعلیم و نظام تدریس میں گذشتہ دو دہائیوں میں بڑی تبدیلیاں کی ہیں۔ منطق و فلسفہ کی منتہی اور غیر ضروری کتابوں کو ہٹا کر ان کی جگہ عصری علوم کو شامل کیا ہے۔ مثلا یہاں درجۂ سابعہ میں کمپیوٹر سائنس اور جدید علم سائنس داخل نصاب ہیں۔ درجۂ خامسہ میں جمہوریہ ہند کا دستور اساسی اور مبادی سیاسیات جب کہ درجۂ سادسہ میں ورلڈ کانسٹی ٹیوشن دو دہائیوں سے شامل نصاب ہیں۔ اسی طرح انگریزی زبان کو درجۂ ثانیہ سے درجۂ فضیلت تک لازمی مضمون کے طور پر شامل درس کیا گیا ہے۔

سائنس science: لاطینی زبان کا لفظ ہے جس کا معنی علم ہوتا ہے۔ عربی میں لفظ علم سائنس کے مترادف ہے۔ ماضی میں مسلم اقوام نے سائنسی میدان میں وہ کارہائے نمایاں انجام دی ہیں کہ جن کے ذکر کے بغیر جدید سائنس کے ارتقا کا سفر شروع نہیں ہوسکتا۔ آج یہ جدید سائنس مسلمانوں کے لیے ایک اجنبی علم بنی ہوئی ہے جس کو حاصل کرنے کے لیے وہ آکسفورڈ، کیمبرج، برطانیہ، ہارورڈ (امریکہ)، اٹلی، جاپان اور فرانس کا سفر کر رہے ہیں۔ کل وہ لوگ ان علوم کی تحصیل کے لیے ہمارے مراکز علم قرطبہ، غرناطہ، اشبیلیہ، سسلی، بغداد، دمشق اور فلسطین کا سفر کیا کرتے تھے۔ مغرب کا نامور مؤرخ اور محقق رابرٹ بریفالٹ Robert Briffault اس حقیقت کا تذکرہ یوں کرتا ہے۔

It is highly probable that but for the Arabs, modern European civilization never have assumed that...... character which has enabled it to transcend all previous phases of evolution. For although there is not a single aspect of European growth in which the decisive influence of Islamic culture is not traceable, nowhere is it so clear and momentous as in the genesis of that power which constitutes the paramount distinctive force of the modern

world and the supreme source of its victory, natural science and the scientific spirit. What we call science arose in Europe as a result of a new spirit of enquiry, of new methods of investigation, experiment, observation and measurement of the development of mathematics in a form unknown to the Greeks. That spirit and those methods were introduced into the European world by the Arabs.(1)

"اس بات کا غالب امکان ہے کہ عرب مشاہیر سے خوشہ چینی کیے بغیر جدید یورپی تہذیب دورِ حاضر کا وہ ارتقائی نقطۂ عروج کبھی حاصل نہیں کر سکتی تھی جس پر وہ آج فائز ہے۔ یوں تو یورپی فکری نشو و نما کے ہر شعبے میں اسلامی ثقافت کا اثر نمایاں ہے لیکن سب سے نمایاں اثر یورپی تہذیب کے اس مقتدر شعبے میں ہے جسے ہم تسخیرِ فطرت اور سائنسی وجدان کا نام دیتے ہیں۔ یورپ کی سائنسی ترقی کو ہم جن عوامل کی وجہ سے پہچانتے ہیں وہ جستجو، تحقیق، تحقیقی ضابطے، تجربات، مشاہدات، پیمائش اور حسابی موشگافیاں ہیں۔ یہ سب چیزیں یورپ کو معلوم تھیں اور نہ یونانیوں کو، یہ سارے تحقیقی اور فکری عوامل عربوں کے حوالے سے یورپ میں متعارف ہوئے۔"

جوزف شاخت (Joseph Schacht) اسی حقیقت کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

There is no doubt that the Islamic sciences exerted a great influence on the rise of European science; and in this Renaissance of knowledge in the west there was no single influence, but diverse ones; the main influence was of

(1) Dr. Robert Briffault, Rational Evolution: The Maker of Humanity. P.190-191

course, from Spain, then from Italy and Palestine through the crusaders, who had mixed with Muslims and seen the effect of sciences in Muslim culture.(1)

"اِس اَمر میں قطعی کوئی شبہ نہیں کہ یورپ کی سائنسی فکر پر اِسلامی سائنسی فکر کا گہرا اَثر مرتب ہوا۔ مغرب کی اِس علمی نشاۃِ ثانیہ پر دِیگر کئی اَثرات بھی مرتب ہوئے۔ مگر بنیادی طور پر سب سے گہرا اَثر اندلس (Spain) سے آیا، پھر اٹلی اور فلسطین کی جانب سے اَثرات مرتب ہوئے کیوں کہ صلیبی جنگوں نے مغربی ممالک کے لوگوں کو فلسطینی مسلم ثقافت اور سائنسی اُسلوب سے رُوشناس کرایا"۔

وِل ڈیورانٹ (Will Durant) نے مسلم تہذیب وثقافت کے مغرب میں منتقلی کی تصریح کئی واقعات سے کی:

The first paper-manufacturing plant is Islam was opened at Baghdad in 794 by Al-Fadl, son of Harun's Vezier. The craft was brought by the Arabs to Sicily and Spain, and there passed into Italy and France.(2)

"اسلام کا پہلا کاغذ سازی کا پلانٹ ۷۹۴ء میں بغداد میں ہارون کے وزیر کے بیٹے الفضل نے لگایا۔ عرب یہ فن یہاں سے سسلی اور سپین لائے، اور یہاں سے یہ فن اٹلی اور فرانس منتقل ہوا۔"

سائنس کی تدریس: مدارس اسلامیہ میں سائنس کو دو حصوں میں بانٹ کر پڑھایا جانا چاہیے۔

(۱) Joseph Schacht, The Leacy of Islam. P.426

(۲) Will Durant, the Age of Faith. P.236

پہلی یونٹ: قدیم سائنس **دوسری یونٹ: جدید سائنس**

پھر ان میں سے ہر ایک کے دو پہلو ہیں۔

نظری سائنس (theoretical science)۔**انطباقی سائنس** (applied science)

نظری سائنس عالم فطرت میں کروڑوں سال سے جاری طبیعی قوانین کی دریافت کا نام ہے۔ نظری سائنس میں تحقیقات کے ذریعے عالم فطرت کے ان مخفی قوانین کا ایک حصہ دریافت ہوا ہے جس کو قرآن میں آیات اللہ کہا گیا ہے۔ ان قوانین کی دریافت کا یہ فائدہ ہوا کہ دین خداوندی کے معتقدات مسلّمہ انسانی علم کی بنیاد پر ثابت شدہ حقیقت بن گئے، اور انطباقی سائنس کے ذریعے موجودہ زمانے کو جدید ٹکنالوجی حاصل ہوئی۔

پہلی یونٹ میں عہد وسطی میں مسلم سائنس دانوں کے ذریعے آٹھویں صدی ہجری سے لے کر پندرہویں صدی عیسوی تک جو ایجادات وانکشافات ظہور میں آئے اور جن سائنسی علوم وفنون کو مسلمانوں نے فروغ دے کر منتہاے کمال کو پہونچایا ان پر اسباق شامل کیے جائیں تاکہ مسلم عہد حکومت میں سائنسی علوم کی ترقی کے لیے کی جانے والی کوششوں کا اندازہ لگایا جاسکے، اور مسلمان اپنے شاندار ماضی سے سبق لے کر حال اور مستقبل کو اس کے مطابق کرنے کی کوشش کریں۔

یہاں اختصار کے ساتھ مسلمان سائنس دانوں کے ذریعے سائنس کے مختلف شعبوں میں کی جانے والی دریافتوں اور تحقیقات کا ہم جائزہ لیتے ہیں۔

اندلس کے عظیم مسلمان سائنس داں ابن رشد جسے مغرب میں Averroes کے بدلے ہوئے نام سے یاد کیا جاتا ہے، نے سورج کی سطح کے دھبوں (Sunspots) کو پہچانا۔ Gregorian کیلینڈر کی اصطلاحات، عمر خیام نے مرتب کیں۔(۱) خلیفہ مامون رشید کے زمانہ میں زمین کے محیط کی پیائش عمل میں آئی جن کے نتائج کی درستگی آج کے ماہرین کے لیے

(1) Will Durant, the Age of Faith. P.309

بھی حیران کن ہیں۔ انھوں نے ماہرین فلکیات کو متعیّن کیا کہ وہ تحقیق کریں، بطلیموس کے نتائج کو پرکھیں۔ زمین کو گول تصور کرتے ہوئے انھوں نے زمین کی گولائی کے درجے کی پیمائش 56.66 میل بیان کی۔ اس کے لیے انھوں نے پالیمرا اور سنجر کے مقام سے سورج کے مقام کا یقین کیا۔ ان کی پیمائش ہماری موجودہ پیمائش سے صرف نصف میل زیادہ ہے۔ انھوں نے زمین کا محیط تقریباً بیس ہزار (۲۰۰۰۰) میل بیان کیا۔(۱)

ریاضی، الجبرا، جیومیٹری (Mathematics, Algebra, Geometry)

حساب، الجبرا اور جیومیٹری کے میدان میں الخوارزمی کا شمار مؤسسین علم میں سے ہوتا ہے۔ علم الحساب میں algorism یا algorithm کا لفظ الخوارزمی (al-Khwarizimi) کے نام سے ہی ماخوذ ہے۔ ان کی کتاب "الجبر والمقابلہ" کا بارہویں صدی عیسوی میں عربی سے لاطینی زبان میں ترجمہ کیا گیا۔ یہ کتاب سولہویں صدی تک یورپ کی یونیورسٹیوں میں بنیادی نصابی کتاب (text book) کے طور پر پڑھائی جاتی رہی اور اسی سے عالم مغرب میں الجبرا متعارف ہوا۔(۲) اس کتاب میں تفرّق کے معکوس (Integration) اور مساوات (equation) کی آٹھ سو سے زائد مثالیں دی گئی تھیں۔ اسی طرح صفر (Zero) کا تصور مغرب میں متعارف ہونے سے کم از کم ۲۵۰ سال پہلے مسلمانوں میں متعارف تھا۔ ابن البناء المراکشی نے ریاضی (Mathematics) کی مختلف شاخوں پر ۷۰ کتابیں تصنیف کی تھیں جو بعد ازاں اس علم کا اساسی سرمایہ بنیں۔(۳) الخوارزمی نے کتاب الحساب لکھ کر اعداد کے نظام کی مشکلات کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔(۴) اس نے اپنی تصنیف "الجمع والتفریق" میں حسابی

(۱) Will Durant, the Age of Faith. P.242

(۲) Will Durant, the Age of Faith.

(۳) Berggren- J.L. Episodes in the Mathmatics of Medievel Islam.

(۴) طوقان قدری۔ تراث العرب العلمي في الرياضيات والفلک۔

عمل کے قواعد وضوابط وضع کیے۔(۱)علم ریاضی کی اہمیت ہماری زندگی میں اتنی زیادہ ہے کہ اس کے بغیر سائنسی اور فکری ارتقا کا سفر شروع نہیں ہوسکتا۔ جتنے بھی بڑے بڑے سائنسی دماغ گزرے ان سب نے ریاضی میں غیر معمولی مہارت حاصل کی تھی۔ کیوں کہ ریاضی انسان کو سوچنے کا ایک نیازاویہ دیتا ہے۔ اس میں ذہنی ورزش کا عمل زیادہ ہے۔ یہ علم انسان کی سوچ کی رفتار کو تیز کرتا ہے۔ اس کے نتائج قطعی ہوتے ہیں۔ مدارس اسلامیہ میں ریاضی کے تعلق سے بہت زیادہ بے اعتنائی برتی جارہی ہے۔ یہ علم جتنی توجہ کا مستحق تھا ہم اس پر وہ توجہ نہیں دے سکے۔ ابتدائی ایک آدھ درجوں میں اس کی تدریس زندگی کے مسائل حل کرنے کے لیے کافی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علم المیراث میں پچاس فیصد طلبہ ریاضی سے عدم واقفیت کے سبب صحیح مسئلہ نہیں بناپاتے۔ اسلام نے میراث کے علم کو نصف دین کہا ہے، کیوں کہ یہ علم الحقوق ہے اور یہ منحصر ہے ریاضی پر۔

ہمیں طلبہ کو صرف جمع وتفریق اور فیصد نکالنے تک ہی محدود نہیں رکھنا چاہیے بلکہ درجۂ رابعہ تک اس کو جبر ومقابلہ وجیومیٹری کا پورا علم پڑھانا چاہیے۔ تاکہ وہ دینی علوم میں بھی اجتہادی بصیرت پیدا کرسکیں۔

علم بصریات(Optics Science) علم بصریات پر مسلم دنیا میں جتنا کام ہوا ہے اتنا کام پوری غیر مسلم دنیا میں آج تک نہیں ہوسکا۔ بصریات کے میدان میں اسلامی سائنسی تاریخ کو غیر معمولی عظمت حاصل ہے۔ اس میدان میں ابن الہیثم کی معرکۃ الآرا کتاب ''On Optics'' آج اپنے لاطینی ترجمہ کے ذریعے زندہ ہے۔ اس کتاب کا یورپ کی علمی ترقی میں نمایاں کردار ہے۔ ابن الہیثم نے تاریخ میں پہلی مرتبہ عدسوں (Lenses) کی تکبیری طاقت (magnifying power) کو دریافت کیا۔ ابن الہیثم نے ہی یونانی نظریۂ بصارت کو رد کرکے دنیا کو جدید نظریۂ بصارت سے روشناس کرایا۔ اور ثابت کیا کہ روشنی کی

(۱)عبدالحلیم منتصر، تاریخ العلم ودور العلماء فی العرب فی تقدمہ۔

شعاعیں آنکھوں سے نہیں پیدا ہوتی ہیں۔ بلکہ بیرونی اجسام (external objects) کی طرف سے آتی ہیں۔

الغرض ان کے کام نے نہ صرف Witelo, Roger Bacon اور Peckham جیسے قدیم سائنس دانوں کو متاثر کیا بلکہ دور جدید میں Kepler اور Newton کا تحقیقی کام بھی ان کی تحقیقات اور فراہم کردہ سائنسی بنیادوں پر استوار ہے۔(۱)

علم المیقات (علم توقیت) Time keeping: سورج اور چاند کی گردش، سورج گرہن اور علم المیقات کے بارے میں غیر معمولی سائنسی معلومات البتّانی اور البیرونی جیسے مسلم سائنس دانوں نے فراہم کیں۔ البتانی (۸۷۷ء۔۹۱۸ء) اور البیرونی (۹۷۳ء۔۱۰۵۰ء) نے شہروں کا طول البلد و عرض البلد متعیّن کرکے پنج وقتی نمازوں کے لیے کیلنڈر وضع کیے۔ یہ کام بھی آج سے گیارہ سو سال قبل انجام دیا گیا۔(۲)

علم ہیئت و فلکیات (Astronomy) اور علم نجوم (Astrology) میں اندلس کے مسلمان سائنس داں علی بن خلاف اندلسی اور مظفر الدین طوسی کی خدمات بڑی تاریخی اہمیت کی حامل ہیں۔

ان سے بھی بہت پہلے تیسری صدی ہجری میں قرطبہ (Cordoba) کے عظیم سائنس داں، عباس ابن فرناس نے دنیا کا سب سے پہلا ہوائی جہاز بنا کر اڑایا۔ عباس ابن فرناس نے اپنے گھر میں ایک کمرہ تیار کر رکھا تھا جو دور جدید کی سیارگاہ (Planetarium) کی بنیاد بنا۔ اس میں ستارے، بادل، بجلی کی گرج اور چمک جیسے مظاہر فطرت کا بخوبی مشاہدہ کیا جا سکتا تھا۔(۳)

دوسری یونٹ جدید سائنس:

اس میں یونٹ میں علم کا مرکز مسلم دنیا سے اٹلی اور یورپ منتقل ہو جانے کے بعد

(۱) Henry Smith Williams, A history of science Part-11.

(۲) Philip Hitti, History of the Arabs. P.373-378

(۳) The Encyclopedia al Islam, A.J. Brill, Leiden, 1965- Vol.1, P.11

مغرب کے زیر اثر جو علمی وفکری ترقیاں رونما ہوئیں ان کو پڑھایا جائے۔ اور اس وضاحت کے ساتھ کہ یہ وہی علم ہے، جس کو مسلمانوں نے اپنے دور عروج میں اس حد تک ترقی دی اور اب اس کی جدید شکل یہ ہے۔ یہ اس لیے ضروری ہے کہ مغرب کی یہ تمام تر ترقی مسلمانوں کے علوم کے یورپ منتقلی کے بعد ہوئی ہے۔ اور انگریز سائنس دانوں نے انھیں علوم کو نئی اصطلاحوں میں ڈھال کر مزید تسہیل و تبیین کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کر دیا ہے جس سے علمی دنیا نے یہ سمجھا کہ یہ ساری ایجادات از خود مغرب کی دین ہیں۔ جب کہ حقیقت اس سے مختلف ہے۔

دوسری یونٹ کے پہلے حصے میں نظریاتی سائنس جب کہ دوسرے حصے میں انطباقی سائنس کے بارے میں پڑھایا جائے۔

نظریاتی سائنس میں وجود کائنات۔ نظریہ بگ بینگ (Big Bang) حیاتیاتی ارتقا کا نظریہ۔ جاذبیت، کشش ثقل، نظریۂ اضافیت (theory of relativity)، اور قیامت وغیرہ کے نظریات بہت ہی اہم ہیں۔ اس کے تیسرے یونٹ میں انیسویں صدی سے بیسویں صدی کے اندر پیدا ہونے والے ان نظریات کو بھی پڑھایا جاسکتا ہے جنھوں نے موجودہ انسانی دنیا پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ مثلاً ڈراونزم، کمیونزم، مارکسزام، سوشلزم اور مٹیریل ازم وغیرہ۔

قرآنی علم کلام: یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ جدید سائنس کی بنیاد مشاہدات پر ہے مفروضات پر نہیں۔ تجربات پر ہے خیالات پر نہیں۔ جدید سائنس کی تحقیق کا موضوع فطرت (نیچر) ہے فاطر نہیں۔ مخلوق ہے خالق نہیں۔ مصنوعات ہیں صانع نہیں۔ سائنس ،مطالعۂ فطرت "Study of nature" کا نام ہے۔ سائنس کا موضوع ان مظاہر فطرت میں جاری طبعی قوانین کی دریافت ہے۔ اس کا موضوع خالق کی دریافت نہیں ہے۔ اگر تخلیق کے ساتھ ہی اس کا موضوع خالق کی دریافت ہوتا تو یقینا وہ ایک خدا کا اعتراف بہت پہلے کر چکے ہوتے، مگر مصنوعات میں غور وفکر اور مخلوقات پر ریسرچ وتحقیق نے سائنس دانوں کو ایک ناگوار سچائی کے اعتراف کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اب وہ ایک ناقابل تردید حقیقت کی

طرف بڑھتے چلے آرہے ہیں۔ Creation پر تحقیق نے ان کو Creator سے بہت قریب کردیا ہے۔ وہ سچائی یہ ہے کہ یہ کائنات ایک نہایت محکم کائنات ہے اس کائنات کے اندر حیرت انگیز حد تک ہم آہنگی اور نظم پایا جاتا ہے۔ کائنات اتنی منظم ہے کہ اس کے موجودہ ڈھانچے میں معمولی تبدیلی بھی اس کو درہم برہم کرنے کے لیے کافی ہے۔ مثال کے طور پر ساری کائنات ایٹم سے بنی ہوئی ہے اور ہر ایٹم نیوٹران اور پروٹان کا مجموعہ ہے۔ نیوٹران کسی قدر وزنی ہوتا ہے اور پروٹان کسی قدر ہلکا۔ یہ تناسب بے حد اہم ہے، کیوں کہ اگر اس کا الٹا ہو، یعنی پروٹان بھاری اور نیوٹران ہلکا تو معلوم قوانین کے مطابق ایٹم کا وجود باقی نہ رہے گا۔ جب نیکلیس نہ ہوگا تو ایٹم بھی نہ ہوگا اور جب ایٹم نہ ہوگا تو کیمسٹری بھی نہیں ہوگی اور جب کیمسٹری نہیں ہوگی تو زندگی بھی نہیں ہوگی۔

اس مثال سے آپ نے اندازہ لگالیا ہوگا کہ موجودہ سائنس ناقابل حل سوالات سے دوچار ہے۔ عقلی موقف کے اعتبار سے دوسری اہم بات یہ ہے کہ نظم کا تصور ناظم کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ جہاں نظم ہے وہاں ایک ناظم ضرور ہے۔ ناظم کے بغیر نظم کا تصور، عقلی اعتبار سے محال ہے۔ نظم کی موجودگی ایک مجبورانہ منطق (Compulsive Logic) پیدا کرتی ہے۔ وہ منطق یہ ہے کہ کسی عذر کے بغیر ناظم کی موجودگی کا اقرار کیا جائے۔

کیا یہ ممکن ہے کہ پتھر کے کسی اسٹیچو نے اپنے آپ کو بامعنی طور پر خود ڈیزائن کرلیا ہوگا؟ اس کائنات میں ہر شی ایک محکم قانون طبیعی کی پابند ہے۔ اس کائنات میں بلین کہکشائیں ہیں اور ہر کہکشاں کے اندر دو سو بلین سیارے ہیں جو اپنے اپنے مدار میں گردش کناں ہیں۔ سورج زمین سے نو کروڑ انتیس لاکھ میل کی دوری پر ہے اور زمین تقریباً ڈھائی لاکھ میل کی دوری پر۔ اس کے برعکس اگر سورج زمین سے دو کروڑ میل نیچے کے فاصلے پر آجائے تو یقیناً یہ زمین جل کر راکھ ہوجائے گی اور ہر ذی روح کے لیے ناقابل رہائش ہوجائے گی۔ وہ کون سی طاقت ہے جس نے سورج کو اپنے مدار میں اور چاند کو اپنے مدار میں اور اربوں سیاروں کو آپس میں تصادم سے روک رکھا ہے۔ یہ محکم قوانین جو کائنات کو منظم طور پر کنٹرول کررہے ہیں وہ کہاں

سے آئے۔ مذہب اور جدید سائنس، کائنات کا جو تصور پیش کرتے ہیں وہ کائنات کے علاوہ ایک ایسی ایجنسی کا تقاضہ کرتے ہیں جو کائنات کے باہر سے کائنات کا نظم کر رہی ہو۔

سائنس داں مظاہر فطرت پر صدیوں کی تحقیق کے بعد جس نتیجے پر پہونچے ہیں قرآن اسی کو چودہ سو برس پہلے اس طرح بیان کرتا ہے۔اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ [1] بے شک آسمان و زمین کی تخلیق اور رات و دن کے آنے اور جانے میں عقل والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔

یہی بات سورۃ البقرہ میں کہی گئی ہے۔اس آیت میں مظاہر فطرت کی تخلیق اور رات و دن کے آنے اور جانے میں کون سا طبیعی قانون کام کر رہا ہے اس پر غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے۔پھر کہا گیا اس میں عقل والوں کے لیے نشانیاں ہیں کہ آسمان و زمین کی تخلیق پر ریسرچ و تحقیق کے بعد اس کے خالق کی معرفت حاصل کریں کیوں کہ کوئی بھی مصنوع بغیر صانع کے وجود میں نہیں آتا۔اس طرح رات و دن کی گردش مسلسل توازن اور تسلسل کے ساتھ ایک محکم نظام کی پابندی کے ساتھ ہو رہی ہے آخر وہ کون سی ذات ہے جس نے گردش لیل و نہار میں اس قانون کو جاری کر رکھا ہے۔جب انسان اس پر غور کرے گا تو وہ خدا تک پہونچ جائے گا۔

قرآن نے ہی خالص عقلی سطح پر مذہب اور الٰہیات کی تفہیم کے لیے محکم اساس فراہم کیا ہے صرف اس کو منطبق کرکے جدید علم کلام کی تدوین کا کام باقی رہ گیا ہے۔یہ عصر تقاضہ کرتا ہے کہ آج کے متکلّمین اس کام کو انجام دیں۔

البرٹ آئن اسٹائن (وفات: ۱۹۵۵ء) کو بیسویں صدی کا سب سے بڑا سائنسی دماغ تسلیم کیا جاتا ہے۔آئن اسٹائن نے کائنات کا تفصیلی مطالعہ کیا۔اس نے کائنات کے ہر حصے میں حیرت ناک حد تک معنویت (meaning) پائی۔یہ دیکھ کر اس نے کہا کہ عالم فطرت کے بارے میں سب سے زیادہ ناقابل فہم بات یہ ہے کہ وہ قابل فہم ہے:

---

[1] آل عمران، آیت ۱۹۰

The most incomprehensible fact about nature is that it is comprehensible.[1]

آئن اسٹائن اپنے اس قول میں بالواسطہ طور پر خدا کے وجود کا اقرار کر رہا ہے۔ اگر اس کے اس قول کو بدل کر کہا جائے تو اس طرح ہوگا: ''خدا کے بغیر عالم فطرت مکمل طور پر ناقابل فہم رہتا ہے اور خدا کے ساتھ عالم فطرت مکمل طور پر قابل فہم بن جاتا ہے''۔

سائنس داں اگرچہ اپنے مخصوص مزاج کے سبب خدا (God) کا لفظ بولنے سے احتراز کرتے ہیں لیکن نام کے بغیر وہ اس حقیقت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہیں۔

عقائد اسلامیہ کے باب میں جو کتابیں آج مذہبی درسگاہوں میں پڑھائی جاتی ہیں ان میں بیشتر وہ ہیں جو عہد عباسی میں یا اس کے بعد لکھی گئی ہیں۔ ان کتابوں میں استدلال اور بحث کا اسلوب قدیم فلسفیانہ طرز فکر پر مبنی ہے یہ قاصر ہے کہ آج کے عقلیت پرست انسانوں کو عقلی بنیادوں پر مطمئن کر سکے۔ آج کا سائنسی عصر تقاضا کرتا ہے کہ آج کے متکلّمین اسلام جدید علم کلام کو سائنسی طرز استدلال پر مدون کریں۔ باب الٰہیات، نبوات، وحی، قرآن اللہ کا کلام ہے، بعث بعد الموت، قیامت، فرشتے اور علم غیب جیسے مباحث کو جدید سائنسی دلائل کے ساتھ قطعی طور پر مرتب کیا جا سکتا ہے جس کی ایک مثال باب الٰہیات میں گزر گئی۔

علم غیب کی عقلی تفہیم: قدیم زمانے میں علم غیب کو صرف ایک دینی عقیدہ کے طور پر سمجھا جا سکتا تھا۔ بغیر کسی مادی آلہ کے دور دراز مقام پر رہتے ہوئے بھی ہزاروں کلومیٹر کی دوری سے کسی کی گفتگو سن لینا اور اس کو دیکھ لینا۔ یہ بہت ہی پر اسرار معاملہ بنا ہوا تھا جس کی عقلی توجیہ ممکن نہ تھی لیکن بیسویں صدی میں مواصلات کی حیرت انگیز ایجادات نے اس حقیقت کا سمجھنا فہم سے قریب کر دیا ہے۔ آج موبائل اور ٹیلیفون کے ذریعے بغیر کسی محسوس تار کے گھر بیٹھ کر انسان ہزاروں میل دوری پر بیٹھے شخص سے بات کر رہا ہے، نہ صرف سن رہا ہے بلکہ اسے

[1] A most incomprehensible thing, Albert Einstein.

دیکھ بھی رہا ہے۔ وہ کون سی ایسی چیز ہے جس نے حجابات کو اٹھادیا ہے۔ جب ایک انسان مادی چیزوں پر توانائی صرف کر کے کائنات میں پھیلے ہوئے خدا کے نور کو مسخر کر کے دور بیٹھے شخص سے بات چیت کر سکتا ہے تو اللہ تعالی کے بندے اس کائنات میں پھیلے ہوئے اس کے مخصوص برقی کرنٹ کے ذریعے کیوں نہیں دور تک دیکھ سکتے ہیں۔ عالم غیب کے پردوں میں کیوں کر نہیں جھانک سکتے ہیں۔

علم کلام کی قدیم کتابوں میں جن فرقوں کا رد پایا جاتا ہے آج وہ فرقے روے زمین پر کہیں بھی موجود نہیں ہیں مثلا معتزلہ، کرامیہ، اسمٰعیلیہ وغیرہ۔ بلکہ ان کی جگہ نئے فرقے ظہور میں آچکے ہیں۔ دہریہ، نیچریہ، قادیانیہ اور موجودہ خارجیہ ارہابیہ وغیرہ ان فرقوں کے عقائد اور ان کے دلائل کا علم کلام کی کتابوں میں تفصیلی طور پر جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

جامعہ حضرت نظام الدین اولیا کا انقلاب آفریں قدم

محمد رضا قادری مصباحی
پرنسپل: جامعہ حضرت نظام الدین اولیا
محررہ:۲۰۱۱ء

جامعہ حضرت نظام الدین اولیا نے جتنی قلیل مدت میں کامیابیوں کی طویل شاہراہ کو طے کیا ہے وہ جماعت اہل سنت کے لیے کسی نویدِ مسرت سے کم نہیں، اور یہ صدقہ ہے اس مرد درویش اور قلندر صفت شخصیت کا جن کی آہ نارسا اور سوز دروں نے دہلی جیسی ناہموار زمین پر ایک عظیم دینی مرکز کو وجود بخشا۔ دہلی جو بائیس (۲۲) خواجگان کی راجدھانی تھی اور جس کی پیشانی پر ہماری سات سو سالہ عظمت رفتہ کے نقوش اب بھی ثبت ہیں، سقوطِ دہلی (۱۸۵۷ء) کے بعد اس پر غیروں کا تسلط ہو چکا تھا۔ نوّے فیصد اولیاے کرام کے آستانے، اب بھی ان کے زیر تصرف ہیں۔ ایسے وقت میں اعصاب شکن حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے، قائد اہلسنت، علامہ ارشد القادری قدس سرہ نے، محلّہ ذاکر نگر، نئی دہلی میں جامعہ حضرت نظام الدین اولیا کی بنیاد رکھی، تاکہ دہلی کی پژمردہ سنیت کو پھر سے تازگی بخشی جائے۔ اندازہ یہ ہوا کہ دہلی میں آج بھی سنی عوام کی اکثریت ہے لیکن بروقت ہماری قیادت کے فقدان نے ہمارے ہاتھوں سے دہلی کو چھین لیا۔

قیامِ جامعہ کے بعد کے دور کو دہلی کی سنیت کی نشأۃ ثانیہ کا دور کہا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد یہاں اہلسنت و جماعت کے سینکڑوں تعلیمی و تربیتی ادارے قائم ہوئے۔ چار سو (۴۰۰) سے زائد مساجد تعمیر کی گئیں۔ ہمارے سنی علما نے بھی باضابطہ دہلی کا رخ کرنا شروع کر دیا۔ یونیورسٹیز کی دنیا میں ہماری نمائندگی صفر تھی، خال خال، کہیں کہیں معدودے چند لوگ یہاں کی عصری دانشگاہوں میں زیر تعلیم تھے۔ جیسے پروفیسر، ڈاکٹر غلام یحیٰ انجم صاحب، صدر شعبۂ دینیات، جامعہ ہمدرد، جامعہ کے قیام کے بعد پہلی بار جماعتی سطح پر یہ خوشگوار انقلاب آیا کہ مدارسِ اہلسنت کے ممتاز طلبا نے جامعہ ہذا میں داخلہ لیا اور یہاں سے فارغ ہونے کے بعد

یونیورسٹی کی دنیا کا رخ کیا اور اپنے اپنے میدانوں میں نمایاں کامیابیاں حاصل کیں۔ مثلا: مولانا سجاد عالم مصباحی، ریسرچ اسکالر جرمن یونیورسٹی (جرمنی) اور ڈاکٹر محمد افضل مصباحی، دستاویز نگار، روزنامہ راشٹریہ سہارا، نئی دہلی وغیرہما۔ ان لوگوں نے جامعہ ہذا کا دو سالہ کورس مکمل کرنے کے بعد عصری اداروں میں بھی نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ اللہ تعالی کا شکر ہے کہ آج دہلی کی یونیورسٹیز میں مدارسِ اہلسنت کے سینکڑوں طلبا زیر تعلیم ہیں جو روشن مستقبل کی علامت ہیں۔

جامعہ کی خدمات کئی پہلوؤں سے لائق ستائش ہیں۔ ایک طرف جامعہ نے ملکی سطح پر ہمارے طلبہ کے لیے عصری اداروں میں داخلہ کے راستے ہموار کیے تو دوسری طرف عالمِ اسلام کی سب سے بڑی اور قدیم یونیورسٹی، جامعۃ الازہر مصر میں اپنے طلبہ کو بھیج کر عالمی قیادت کے لیے افراد تیار کیے، جس کا نمونہ مولانا منظر الاسلام ازہری (امریکہ) مولانا نعمان احمد ازہری استاذ: جامعۃ البرکات، علی گڑھ وغیرہما کی شکل میں دیکھ سکتے ہیں۔ یہ تو ماضی کی باتیں رہیں، جامعہ کی حالیہ پیش رفت کے بارے میں ہم صرف اتنا کہہ دینا کافی سمجھتے ہیں کہ فی الوقت تعلیمی، تربیتی اور تعمیری میدانوں میں جامعہ کی غیر معمولی پیش رفت مستقبل قریب میں کسی خوش گوار انقلاب کا اشاریہ ہے۔

گذشتہ تمام سالوں کے برعکس امسال کے سالانہ مجلّہ ”کاروان رئیس القلم“ جو آپ کے ہاتھوں میں ہے، اس کی ادارت کی تمام ذمہ داریاں ہمارے باذوق، محنتی اور جفاکش طلبہ نے خود انجام دیں۔ ہر طالب علم نے اپنے اپنے مضامین خود ٹائپ کیے۔ باہر سے آئے ہوئے تمام مضامین کی پروف ریڈنگ، تصحیح اور ایڈیٹنگ کا فریضہ اپنے مشفق اساتذۂ کرام کی نگرانی میں انجام دیا۔ اس سے جہاں ان کے حوصلے بلند ہوئے وہیں عملی میدان میں قدم رکھنے کا بھی موقع ملا۔ تخصص فی الادب والدعوہ کے وہ پانچ طلبہ جنھوں نے اساتذۂ کرام کی رہنمائی میں ادارت کے فرائض انجام دیے، ان کے نام حسب ذیل ہیں: محمود غازی فیضی، محمد رضا فراز مصباحی، محمد احمد مصباحی نظامی، محمد نورالدین مصباحی اور محمد علی سرور مصباحی۔ ان کے علاوہ بقیہ طلبہ نے

بھی اس کام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور ان کے ہاتھ بٹائے۔ عزیز گرامی مولانا محمد حسنین رضا نے بھی بہت سے مضامین کمپوز کیے اور شبانہ روز کی غیر معمولی جد و جہد کے بعد سالنامہ کو منظر عام پر لانے میں کامیابی حاصل کی۔ میں صمیم قلب سے ان تمام حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور دعاگو ہوں کہ رب جلیل ان کی بے لوث خدمات کو قبول فرماکر اجر جزیل عطا فرمائے۔

اس موقع پر میں اپنے اساتذۂ کرام کی ہمتوں اور طلبہ پر ان کی شفقتوں کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ انھوں نے ہر قدم پر ان ہونہار طلبہ کی رہنمائی فرمائی، ان کے مقالے کی اصلاح کی۔ خصوصیت کے ساتھ محبّ گرامی قدر حضرت مولانا محمد عرفان ازہری، مولانا شاہد جمال اور مولانا غلام احمد رضا صاحبان (اساتذۂ جامعہ ہذا) کا مشکور ہوں کہ انھوں نے نظر ثانی اور اصلاح کا فریضہ انجام دیا۔ اخیر میں ان تمام حضرات کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں جن کے تعاون سے یہ رسالہ چھپ کر نذرِ قارئین ہو رہا ہے اور ان ارباب قلم کا بھی جنھوں نے اپنے قلمی تعاون سے اس کاروان کو آگے بڑھانے میں کسی طور پر مدد کی۔

مدارس اسلامیہ اور عہد حاضر - تقاضے اور رویّے

محمد رضا قادری مصباحی

مرقومہ: ۱۴؍ فروری ۲۰۱۶ء

آج کی حیرت انگیز مادہ پرستانہ زندگی میں، جہاں ہر چہار جانب دولت کی حرص و ہوس دکھائی دیتی ہے، جہاں مصنوعی برقیاتی زندگی نے ماضی کے اَقدارِ حیات کو قصۂ پارینہ بنادیا ہے۔ دولت و ثروت، جاہ و اقتدار انسان کے اشرف و اعلی ہونے کا معیار ٹھہرا۔ جہاں زندگی کے تمام فاصلے سمٹ چکے ہیں۔ سالوں کا کام ہفتوں میں اور ہفتوں کا گھنٹوں میں ہو رہا ہے۔ سائنس و ٹکنالوجی اور دولت کی کرشمہ سازی نے وہ سب کچھ کر دکھایا جو صدیوں قبل ناممکن دکھائی دے رہا تھا۔ عسکری نظام سے لے کر دفتری نظام تک سب جدیدیت کے ڈھانچے میں خود کو ڈھال چکے ہیں۔

سیاست، قیادت، صحافت اور تجارت و معیشت کے سارے اصول ایک نئ حکمت عملی کا لبادہ پہن چکے ہیں۔ قوموں کے عروج و زوال کا معیار مادی اور سائنسی برتری یا پستی ٹھہرا۔

مذہبی، اخلاقی اور روحانی زندگی بسر کرنا قدامت پسندی، بنیاد پرستی ٹھہرا ایسے دور میں مدرسوں کو عصر جدید کے ہتھیاروں سے مسلح نہ کرنا، جدید ٹکنالوجی سے استفادہ نہ کرنا مدرسوں کو اپنی موت آپ مارنے کے مترادف ہوگا؛ کیوں کہ کوئی بھی ادارہ موجودہ کنڈیشن کے ساتھ عرصۂ دراز تک اپنے وجود کو باقی نہیں رکھ سکتا۔

مدرسوں کا بڑا المیہ یہ بھی ہے کہ گزشتہ کئی سو سال کی تاریخ میں ہمارے یہاں سے کوئی قابل ذکر سائنس داں نہیں پیدا ہو سکا۔ مسلمانوں میں جو بھی بڑا سائنسداں پیدا ہوا وہ مغرب کی پیداوار تھا۔ جب کہ یہی کام اسپین کے اسلامی عہد میں مدرسوں سے ہوا کرتا تھا۔

ہم نے قرآن و حدیث کے نور سے کسب فیض کرتے ہوئے فقہ و تفسیر، کلام، بلاغت، معانی، بدیع، بیان، عروض، تاریخ، سیرت اور نحو و صرف جیسے علوم و فنون کو آگے تو بڑھایا لیکن ان ہی مصادر سے اقتباس نور کرتے ہوئے سائنس و ٹکنالوجی کے علوم و فنون سے مکمل

انحراف کیا۔ اس کے لیے نہ ادارے قائم کیے نہ شعبے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ ۸۰۰ رسال تک مشرق اور اسلامی دنیا میں ہونے والی سائنسی پیش رفت اور سرگرمیوں کا مرکز مغرب منتقل ہو گیا۔ مسلمان اب دینے والے نہیں بلکہ لینے والے بن گئے۔ جدید تحقیقات کا جو کام اسلامی دنیا کے زیر اثر ہونا چاہیے وہ غیر اسلامی دنیا میں ہونے لگا۔

یہ حقیقت ہے کہ جن بنیادوں پر آج کی جدید سائنس کھڑی ہے اس کی بنیادی اینٹوں کی دریافت مسلم سائنس دانوں نے کی تھی۔ کائناتی علوم (طبیعیات) ہوں یا ریاضیاتی اصول، علم کیمیا ہو یا الجبرا۔ ان سب کی دریافت اسپین کے مسلم سائنس دانوں نے کی۔

ابن سینا کی کتاب ''القانون فی الطب'' صدیوں تک یورپ کی یونیورسٹیوں میں میڈیکل سائنس کی اساسی کتاب کے طور پڑھائی جاتی رہی۔

مسلم دنیا سے سائنس کی نقلِ مکانی نے پوری مسلم دنیا کو علم وفکر کے میدان میں تہی دست اور یتیم بنا دیا۔ اس تہی دستی کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ جدید اسلحہ سازی کے میدان میں مسلمان، اہل مغرب سے کم از کم ۲۰۰ رسال پیچھے رہ گئے۔ وہ عظیم توپ، ٹینک، میزائیل اور جنگی راکیٹس ایجاد کر رہے تھے تو ہمارے اصحاب اقتدار تلوار، نیزہ اور تیر سازی کے کارخانے بنا رہے تھے۔ یا خود سپردگی کرتے ہوئے اہل مغرب سے اسلحہ کی بھیک مانگ رہے تھے۔ جب وہ بیلسٹک میزائیل اور ایٹم بم تیار کر رہے تھے تو ہمارے ارباب اقتدار اپنے آپسی اختلافات اور خانہ جنگی میں الجھے ہوئے تھے۔

مسلم ارباب اقتدار کی ترجیحات بدل گئیں: جس عہد میں انگلینڈ میں ۱۱۶۷ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی (Oxford University) اور ۱۲۰۹ء میں کیمبرج یونیورسٹی (Cambridge University) کی بنیاد رکھی جا رہی تھی، اس عہد میں مسلم ہندوستان میں ۱۱۹۳ء میں قطب مینار تعمیر کیا جا رہا تھا۔ جب امریکہ کے اندر ۱۶۳۶ء میں ہارورڈ یونیورسٹی (Harvard University) قائم کی جا رہی تھی تو مغل بادشاہ، شاہ جہاں ٹھیک اسی دور

میں ۱۶۳۰ء میں آگرہ کے اندر مشہور زمانہ عجائب خانہ مقبرہ ''تاج محل'' کی تعمیر کا سنگ بنیاد رکھ رہے تھے، جو مسلسل ۲۲/ سالوں تک جاری رہی۔

جس عہد میں جاپان کے غیر مسلم بادشاہ ۱۲/ اپریل ۱۸۷۷ء کو ٹوکیو میں ''ٹوکیو یونیورسٹی'' کی بنیاد رکھ رہے تھے ٹھیک اس سے ۹۳/ سال قبل ۱۷۸۴ء میں لکھنؤ کے اندر نواب آصف الدولہ ''بھول بھلیّا'' نام کے مشہور زمانہ عجائب خانے کی بنیاد رکھ رہے تھے۔ جس کی تعمیر ہی میں چالیس سال صرف ہوگئے۔ اس سے مسلم ارباب اقتدار کی ترجیحات اور ان کی نفسیات کا آپ بخوبی اندازہ کرسکتے ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ مغرب علم کی دنیا میں ہمارا امام بن گیا اور ہم اس کے مقتدی۔ وہ ہمیں دینے والا بن گیا اور ہم لینے والے۔ بھلا ہو سرسید احمد خان کا جس نے ۱۸۷۵ء میں محمدن اینگلو اورینٹل کالج، علی گڑھ، قائم کرکے ہندوستانی مسلمانوں کو سائنس، تاریخ و فلسفہ، ریاضی اور طبیعیات جیسے موضوعات کو پڑھنے اور اس میں تحقیق کی طرف مائل کیا۔ یہی ادارہ بعد میں چل کر ۱۹۲۰ء میں مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کا درجہ حاصل کرتا ہے۔ جس کے قیام سے یقیناً غیر منقسم ہندوستان کے مسلمانوں کو آکسیجن میسر آئی۔ پھر اسی کے بطن سے ۱۹۲۰ء میں محلہ قرول باغ نئی دہلی میں، جامعہ ملیہ اسلامیہ کا وجود عمل میں آیا۔ ان دونوں دانش کدوں سے اب تک لاکھوں چراغ روشن اور ہزاروں دانش کدے وجود و بقا حاصل کرچکے ہیں اور جس کی ضوفشانیوں سے حرارت پاکر آج بھی ظلم کے خلاف ہزاروں پرچم بلند ہوتے رہتے ہیں۔

قیادت کے لیے اعلیٰ بصیرت چاہیے

محمد رضا قادری مصباحی
پرنسپل جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء، ذاکر نگر، نئی دہلی

قیادت عربی زبان کا لفظ ہے جو قود سے ماخوذ ہے، اس کا معنی ہے آگے کی طرف سے کھینچنا، لشکر کی قیادت کرنا (المعجم الوسیط) اور قائد وہ ہوتا ہے جو کسی کو کھینچ کر آگے کی طرف لے جائے۔

قیادت (**Leadership**) کیا ہے؟ قیادت، نفس واقعہ کے اعتبار سے اپنے آپ میں ایک غیر معمولی عمل ہے۔ قیادت، انتہائی مخلصانہ جد و جہد (**Struggle**) کا نام ہے جس کے لیے قائد کو آخری حد تک بے لوث ہونے کی ضرورت ہے۔ قیادت سے قوموں کی تقدیریں بنتی یا بگڑتی ہیں۔

صحیح قیادت، قوم یا ملک کو تعمیر کی راہ پر لے جاتی ہے، جب کہ غلط قیادت تخریب کی راہ پر۔ قیادت کا معاملہ تمام تر اس امر پر مختصر ہے کہ قائد اپنی قوم یا ملک کے لیے کس حد تک قربانی دے سکتا ہے، کیوں کہ قائد کو مخالف ہواؤں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور طوفانوں سے ٹکرانا ہوتا ہے۔

کسی بھی قوم کے لیے قائد کا انتخاب بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس انتخاب (**Choice**) سے لوگوں کی اجتماعی سوچ کا پتہ چلتا ہے۔ قائد کا صحیح انتخاب اسے اعلی کامیابی تک پہنچاتا ہے اور غلط انتخاب (**Choice**) پوری قوم کو ناکامی کی طرف لے جاتا ہے، قائد کی اعلی بصیرت جنگ کی شکست کو فتح میں تبدیل کر سکتی ہے جب کہ ناقص بصیرت اسے شکست سے دو چار کر سکتی ہے۔

قائد اپنی قوم کا نمائندہ اور اس کا معمار ہوتا ہے۔ قائد کے ایک صحیح اِقدام سے کبھی قوم کی تقدیر جاگ اٹھتی ہے اور کبھی اس کی معمولی سی لغزش پوری سوسائٹی (**Society**) کے لیے برسوں کی ناکامی کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔

قائد، دور اندیش ہوتا ہے، وہ آج کو نہیں بلکہ آج سے پچاس سو سال آگے تک دیکھتا ہے۔ عام حالتوں میں انسان صرف دو آنکھوں کا استعمال کرتا ہے لیکن قائد کے لیے ضروری ہے کہ وہ باطنی آنکھیں (دل، دماغ) جو اللہ تعالیٰ نے اسے بصیرت کے لیے اضافی طور پر عطا فرمائی ہیں ان کا بھی استعمال کرے۔

قائد اپنی قوم کا سفیر ہوتا ہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ آنکھ والا ہو، حالات پر اس کی گہری نظر ہو، وہ اپنے گرد و پیش کے بارے میں اس قدر حساس ہو کہ سطح سمندر پر دکھائی دینے والی لکیروں سے کسی خاموش طوفان بلاخیز کی آمد کا اندازہ کر سکے۔

قیادت کے لیے غیر معمولی دانشمندی، غایت درجہ تدبر، اور جرأت وبسالت کی ضرورت ہوتی ہے۔ جہاں قائد کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ مضبوط قوت ارادی کا مالک ہو اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ایک اچھا سائیکولوجسٹ (Psychologist) ماہر نفسیات ہو تا کہ وہ لوگوں کے عمل اور ردعمل کے اسباب سے بروقت خبردار ہو سکے۔

ان لوگوں کا شمار مردہ قوموں میں ہوتا ہے جن کے پاس کوئی قائد نہیں ہوتا، بے قائد قوم کی مثال اس کے بچے جیسی ہے جسے ماں ہلکی سی ضرب کے بعد تھپکیاں دے دے کر سلا دیتی ہے اور اس سادہ لوح انسان کی طرح ہے جسے جو چاہتا ہے جب چاہتا ہے اپنے مقصد کے لیے استعمال کر لیتا ہے۔ الکشن کے زمانے میں سبز باغات دکھا کر ان کے ووٹ حاصل کرتا ہے اور ایوان حکومت میں پہنچنے کے بعد اپنے تمام وعدے فراموش کر بیٹھتا ہے۔

آج کا معاشرہ (**Muslim Society**) اسی ابتر حالت کا شکار ہے بہت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ قیادت کے نام پر ہمارے یہاں ہزاروں قائدین ہیں، خواہ وہ مذہبی میدان ہو یا سیاسی میدان، ہر دو میدانوں میں خود ساختہ نااہل اور بے بصیرت قائدین کی کمی نہیں اور ان نام نہاد قائدین کی غیر ذمہ دارانہ قیادت اور نااہلی کی وجہ سے مذہبی و سیاسی دونوں سطحوں پر نقصان کا جو بوجھ امت مسلمہ کو اٹھانا پڑ رہا ہے وہ ناقابل تلافی ہے، جس کے تدارک کے لیے ایک صدی بھی ناکافی ہے۔

سیاسی و سماجی

مضامین

امریکہ کی اقتصادی پالیسی

محمد رضا قادری مصباحی

مرقومہ: یکم جنوری ۲۰۱۲ء

قارئین پر یہ بات مخفی نہیں ہوگی کہ اکیسویں صدی کی شروعات کے ساتھ ہی دنیا پھر ایک بار جنگی الاؤ میں جھلس چکی ہے۔ اب بڑی تیزی کے ساتھ تیسری عالمی جنگ کا میدان گرم کرنے کی راہ ہموار کی جارہی ہے۔ اور یہ تیسری عالمی جنگ (3^{rd} World War) گزشتہ دو عالمی جنگوں سے کہیں زیادہ بھیانک اور ہلاکت خیز ہوگی؛ کیوں کہ ارتقاے نسل انسانی کے ساتھ ہی جدید کیمیائی اور متنوع جنگی آلات محض بیسویں صدی کے اواخر اور اکیسویں صدی کے اوائل کی ایجادات میں سے ہیں اور ان کے مہلک اثرات کئی نسلوں تک منتقل ہوں گے۔

۲۰۰۱ء میں امریکہ نے افغانستان پر بمباری کرکے اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ وہاں کے پہاڑوں کو سرمہ اور عمارتوں کو ملبوں کے ڈھیر میں تبدیل کردیا۔ ہزاروں بچوں کو یتیم اور ہزاروں خواتین کو بیوہ کردیا۔ ابھی ۲۰۰۱ء میں لگایا ہوا زخم مسلمانوں کے دلوں سے مندمل بھی نہیں ہوا تھا کہ عراق پر کیمیائی اسلحہ بنانے کا الزام لگا کر اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی۔ اور صدام کی حکومت کو پاش پاش کرکے عراق کے تیل کے ذخائر پر غاصبانہ قبضہ کرلیا۔ ۲۵؍ سالوں تک عراق پر حکمرانی کرنے والے اور امریکہ و اسرائیل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے والے حوصلہ مند شیر دل، صدام حسین پر مقدمہ چلاکر ۲۰۰۶ء میں ذی حجہ کی ۱۰ تاریخ کو تختۂ دار پر لٹکادیا گیا۔ ۲۰۱۱ء میں صدر حسنی مبارک کا تختہ الٹنے کے لیے امریکہ نے مصر میں بغاوتیں کرائیں۔ مرد آہن کرنل معمر قذافی کے لیبیا پر ناٹو افواج سے بمباری کرواکر اس کا تختہ الٹ دیا گیا اور گولی مار کر قذافی کو ہلاک کیا گیا۔ تیونس میں انقلاب آیا، بحرین کے دارالحکومت ''منامہ'' میں حکومت کے خلاف مظاہرے ہوئے۔ اب شام کے صدر بشار الاسد کی باری ہے۔ یمن میں بغاوتیں اور سورش بپا کرکے صدر عبداللہ صالحی کے خلاف احتجاج کرایا گیا۔ فلسطین کے نہتے مسلمانوں کی ۵؍ سالوں سے ناکہ بندی کردی گئی ہے، ان

تک رسد اور اشیاے خورد و نوش پہنچنے کے تمام ذرائع پر پہرے بٹھا دیے گئے ہیں۔ بیت المقدس کے مشرقی دروازہ کو گرادیا گیا اور اب فلسطین کے بیت المقدس کو صیہونی راجدھانی میں بدلنے کی تیاری چل رہی ہے یروشلم کو اسرائیل کی راجدھانی بنانے کی تیاری زوروں پر ہے۔

اسی طرح امریکہ و اسرائیل کے لیے درد سر بنے ہوئے ایران پر فوج کشی کا پورا پلان دونوں نے تیار کرلیا ہے۔ ۲۰۱۱ء ہی میں امریکہ کے سب سے بڑے مطلوب دہشت گرد اسامہ بن لادن کو ایبٹ آباد میں آپریشن کرکے ہلاک کردیا گیا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر اتنی خونین جنگیں لڑکے کے بعد بھی امریکہ کی ہمت پست نہ ہوئی اور اس کی اقتصادی قوت کمزور نہ ہوئی! جب کہ امریکہ نے ان جنگوں پر صرف ایک دہائی میں کھربوں ڈالر خرچ کردیے ہیں۔ پھر بھی اس کی معیشت متاثر نہیں ہوئی۔ امریکہ میں اتنا بڑا اقتصادی بحران نہیں آیا جتنا کہ آنا چاہیے۔ زندگی کے ہر میدان میں اس کی ترقی اسی تیز رفتاری کے ساتھ ہے۔ یہ انتہائی اہم سوال ہے جس کا جواب تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔

راقم سطور اپنے مشاہدات اور اقوام عالم کے مطالعہ کے بعد جس نتیجے پر پہنچا ہے اسے ذیل کی سطور میں بصورت جواب ملاحظہ فرمائیں:

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس قد جنگوں کے بعد امریکہ کی اقتصادی کمر ٹوٹ جانی چاہیے۔ امریکہ ہو یا اسرائیل یا اور کوئی یورپی ملک ہم اس کو جتنا بڑا ظالم چاہیں کہہ سکتے ہیں لیکن انھیں بے وقوف نہیں کہہ سکتے۔

امریکہ کی پالیسی ان چند امور پر منحصر ہے:

(۱) لڑاؤ اور حکومت کرو۔

(۲) ایک ملک کا خوف دوسرے ملک پر مسلط کرکے اپنے اسلحے بیچو اور اس کے ذریعہ اقتصادی بحران کا مقابلہ کرو۔

اول الذکر لڑاؤ اور حکومت کرو۔ اس کا نظارہ ہمیں ہر اس مسلم ملک میں دیکھنے کو ملتا ہے جو ترقی کی راہ پر لگا ہوا ہے۔ اور ثانی الذکر کا نظارہ ہم مسلم ممالک میں کررہے ہیں۔

(۳)امریکہ ہر ان دو ملکوں کا حمایتی اور دوست ہے جن کے درمیان کھلی دشمنی ہے۔ مثلا انڈیااور پاکستان وغیرہ۔اور دونوں کواسلحے فراہم کرتا ہے۔

ابھی روزنامہ راسٹریہ سہارامیں تازہ ترین خبر چھپی جس کی سرخی یہ تھی:

سعودی عرب کوامریکہ جدید جنگی طیارے فروخت کرے گا

اس سودے میں ایف ۱۵/طرز کے طیارے بھی شامل ہیں کئی جہازوں کی تجدید کی جائے گی

۳۰/دسمبر۲۰۱۱ءکی خبر ہے جو واشنگٹن نے اوباما کے حوالے سے نشر کی ہے۔

اوباما انتظامہ نے سعودی عرب کو ایف ۱۵/طرز کے جدید جنگی طیارے بیسیوں کی تعداد میں فروخت کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔اس دفاعی معاہدے کی مالیت تقریبا۳۰/بلین ڈالر بنتی ہے۔

اس معاہدے کے تحت امریکہ کی طرف سے اس عرب اتحادی ملک کو ۸۴ نئے جنگی طیارے دیے جائیں گے جب کہ ۷۰ دیگر طیاروں کواپ گریڈ کردیا جائے گا۔

امریکہ عرب ممالک پر ایران کا خوف سوار کرکے اپنے اسلحے بیچنا چاہتا ہے تاکہ اس کی اقتصادی قوت بحال رہے۔

کاش میرے قلم سے آتش سیال کے شعلے ٹپکتے!

کہا جاتا ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ اکیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں چن چن کر دنیا کی طاقتور ترین مسلم سلطنتوں کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی۔ سر بفلک عمارتیں منٹوں میں ملبوں کا ڈھیر بن گئیں۔ اگر ہم اس ظلم و سفاکی کا موازنہ ۱۳/ ویں صدی میں ہونے والے چنگیزی حملوں سے کریں تو بے جانہ ہوگا۔ اس وقت بھی حالات کچھ ایسے ہی تھے۔ مسلم حکمرانوں کی عیش کوشی، عالمی مسائل سے غفلت و سرد مہری، باہم خانہ جنگی، یہ وہ مسائل تھے جو مشرق وسطی کی مسلم حکومتوں کے تاخت و تاراج کیے جانے کا سبب بنے۔ آج تاریخ پھر اپنے آپ کو دہرا رہی ہے، ایک بار پھر چنگیزی عہد سے ساری دنیا کے مسلمان گزر رہے ہیں۔ ایک ایک کر کے یکے بعد دیگرے دنیا کی طاقتور ترین مسلم سلطنتوں کو امریکہ، برطانیہ اور اسرائیل نے اپنے قدموں کا فٹ بال بنادیا ہے۔ سر بفلک عمارتیں منٹوں میں ملبوں کا ڈھیر بن گئیں، لاکھوں لوگوں نے اپنی جانیں، جان آفریں کے سپرد کردیں۔

۱۱/ستمبر ۲۰۰۱ء کو ایک منظم سازش کے تحت ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر راکٹ حملہ کرایا گیا، اور بلا تحقیق و تفتیش اس کی ساری ذمہ داری ''القاعدہ'' کے سر تھوپ دی گئی۔

یہ حملہ اتنا شدید اور مہیب تھا کہ زمین کا سینہ دہل کر رہ گیا۔ گویا امریکہ میں آتش فشاں پہاڑ پھوٹ پڑا ہو۔ اس حملے کو بنیاد بنا کر ساری دنیا پر دہشت گردی کا خوف طاری کر کے افغانستان پر چڑھائی کردی گئی۔ مہینوں تک امریکی طیارے وہاں کے مسلم اور نہتے شہریوں پر بمباری کرتے رہے۔ اقتصادی ناکہ بندی کی گئی۔ طالبانی حکومت کے پرخچے اڑادیے گئے۔ اسامہ بن لادن بن عوض کی تلاش میں تورابورا جیسی پہاڑیوں کو سرمہ بنادیا گیا۔

حقیقت یہ تھی کہ افغانستان، اسلام پسندوں کے زیر اثر ایک مسلم ریاست بنتا جارہا تھا۔ افغانی سنیما ہالوں اور عیاشی کی جگہوں پر پابندی لگادی گئی تھی۔ اسلامی تہذیب کو فروغ حاصل ہورہا تھا۔ قبل اس کے کہ مجاہدین کی حکومت کو سرکاری درجہ حاصل ہوتا افغانستان کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی۔ اس حملہ کی آڑ میں شاید اسے ان ہیرے اور جواہرات کی تلاش تھی جو اس کے زعم کے مطابق افغانستان کی صحرائی زمینوں اور خشک پہاڑوں میں رب تعالی نے پوشیدہ کر رکھے تھے۔

افغانستان کے باشندے فطری طور پر قبائلی اور جنگجو واقع ہوئے ہیں۔ شجاعت و جواں مردی

ان کی سرشت میں داخل ہے۔ اس ملک کو تاراج کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس کے جنگجو اس قابل نہ رہ جائیں کہ دوسرے مسلم ممالک کی مدد کرسکیں۔

افغانستان کے خون ناب سے جب خون آشام امریکی و برطانوی ٹینکوں کی پیاس نہ بجھی تو اک نئے شکار گاہ کی ضرورت ہوئی، عراق کی شکل میں وہ شکار اسے مل گیا۔

عراق میں ۲۵؍ سالوں سے صدام حسین کردی کی حکومت تھی۔ اس پر یہ الزام لگایا گیا کہ اس کے پاس وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیار ہیں، نیز عراق، القاعدہ جنگجوؤں کی درپردہ مدد کرتا ہے۔

یہ ایسے الزامات تھے جو تفتیش کے بعد تار عنکبوت کی طرح بکھر گئے۔ امریکہ سے تفتیشی ٹیم بلائی گئی، جس نے عراق کے اسلحہ سازی اکٹرس اور عسکری مراکز کا بھرپور جائزہ لیا۔ اس نے تفتیش کے بعد انکشاف کیا کہ جس قسم کے ہتھیاروں کا خدشہ تھا عراق میں وہ ہتھیار نہیں مل سکے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ امریکہ اب بات آگے نہ بڑھاتا لیکن اسے جب اطمینان ہوگیا کہ عراق میں کوئی ایٹمی اسلحہ نہیں ہے۔ مزید نئی تکنیک کے اسلحے بھی اسے فراہم نہیں ہیں تب اس نے بھرپور وار کرکے عراق کو ختم کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ ۲۰۰۳ء میں دو طرفہ جنگ شروع ہوئی۔ عراقی فوجوں نے بھی خوب جوہر دکھائے۔ اب مرتا کیا نہ کرتا والا حال تھا۔ ادھر اتحادی ممالک کی فوجیں جن کے پاس جدید قسم کے جنگجو میزائل کا بڑا ذخیرہ تھا ادھر عراق کے پاس پرانی اور از کار رفتہ میزائل اور اسلحے وہ بھی محدود مقدار میں، کب تک مقابلہ کرسکتے تھے۔ بالآخر عراق کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی اور عراقی صدر صدام حسین کو گرفتار کرلیا گیا اور مقدمہ چلاکر پہلے پابند سلاسل کیا گیا پھر سزائے موت سناکر ۲۰۰۶ء میں ۱۰؍ ذی حجہ کو تختۂ دار پر لٹکادیا گیا۔

یاد کیجیے! یہی وہ عراق ہے جو عباسی خلفا کی چھ سو سالہ عظمت رفتہ کا امین ہے۔ اس سرزمین پر ۶۵۶ھ تک عباسیوں کی شاندار خلافت قائم تھی۔ ۶۵۶ھ میں ہلاکو خان کی فوج نے عراق کی فصیلوں پر دستک دی اور آندھی طوفان کی طرح یہاں کے شہریوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹتے ہوئے چلی گئی۔ صرف عراق کے اندر ۲۰؍ لاکھ سروں کے مینار تعمیر کیے گئے تھے۔ آخری عباسی خلیفہ معتصم باللہ کو بھی ہلاکو کی فوج نے قید کیا اور نمدہ میں لپیٹ کر اس پر گھوڑے دوڑادیے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

امت مسلمہ کو ملکی اور عالمی سطح پر درپیش خطرات اور ان کو بحران سے نکالنے کا حل

چار سو سالوں کے اندر امت میں جو ضعف ، دنیا کی محبت اور موت سے نفرت پید اہوچکی ہے اس کو ختم کرنے کے لیے فوری طور پر درج ذیل اقدامات کرنے ضروری ہیں۔

۱۔ نئی نسل کی ایمانی و روحانی تربیت۔ اس کو بجائے گورنمنٹ اسکولوں میں پڑھانے کے اسلامی اسکولوں میں پڑھائیں۔ ان کے لیے ایسے ادارے بڑی تعداد میں کھولے جائیں جہاں ان کو دینی و روحانی ماحول میں پوری دنیا کی تعلیم فراہم کی جائے۔ اسلامی یونیفارم سب پر خواہ وہ معلم ہوں یا متعلم لازم کیا جائے۔ مسلمان شاندار محلوں میں نہ رہیں، اپنے پیسے بچاکر قوم کے بچوں اور بچیوں کے لیے اس قسم کے اسکول کھولیں۔

۲۔ مدارس اسلامیہ میں تاریخ غازیان اسلام اور فلسفۂ جہاد کو بطور سبجکٹ شامل کیا جائے۔ طلبہ کی جسمانی تربیت کے لیے پریڈ کا اہتمام کیا جائے۔ مدرسہ میں ایک ورزشی گراؤنڈ ہو جس میں صبح بعد نماز فجر ایک گھنٹہ ان کی جسمانی تربیت ہو۔ انھیں کراٹے اور ورزش سکھائے جائیں۔

۳۔ ہفتہ میں ایک بار روحانی محفل منعقد کی جائے جس میں دنیا کی بے ثباتی اور آخرت سے محبت ان کے دل میں راسخ کیا جائے۔ ان کے قلوب کو ذکر الا اللہ سے گرمایا جائے۔ اور روح و نفس میں لگی بیماری کا خاتمہ کیا جائے۔

۴۔ محرم الحرام کے موقع پر مکمل ایک ماہ - دس ذوالحجہ سے لے کر دس محرم الحرام تک - یا یکم محرم سے ۳۰ر محرم الحرام تک ہر مسلم محلے میں ایک آدھ بیگھ زمین ایکوائر کر کے ان کی جسمانی اور عسکری تربیت کا انتظام کیا جائے۔ شرع کے دائرے میں رہتے ہوئے انھیں کشتی لڑنے کی تعلیم دی جائے۔ اکھاڑے قائم کیے جائیں۔ گھوڑ سواری سکھائی جائے۔ چار پانچ

گھوڑے منگوا کر اس پر اسپ سواری کی تعلیم دی جائے۔ نیزہ بازی اور شمشیر زنی کی تربیت دی جائے۔ تاکہ ان تربیتوں کے نتیجے میں ان کا جوہر شجاعت نکھر کر سامنے آئے۔ ان کے دل سے بزدلی اور مرعوبیت کافور ہوں۔ وہ جسمانی طور پر تواناں اور مضبوط ہوں تاکہ مضبوط ہاتھوں سے اپنے ملک وملت، جان ومال اور عزت نفس کا دفاع کر سکیں۔

کیوں کہ ہندوستان جیسے ماحول میں مسلمان اس سے زیادہ اِعداد کی استطاعت بھی نہیں رکھتے۔

۵۔ مسلمان اپنے سامان صرف مسلمان دکانداروں سے خریدیں۔ اپنے پیسے کافروں کے یہاں نہ لگائیں۔

۶۔ معیشت کو مضبوط کرنے کے لیے مسلمان اپنے پیسوں کو تجارت میں انویسٹ کریں۔

۷۔ نئے مدارس کھولنے سے اجتناب کیا جائے۔ بلکہ پرانے ہی مدرسوں کو کام کے قابل بنایا جائے۔

۸۔ مسلمانوں کے ٪ 98 بچے اسکولوں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھتے ہیں اور صرف ٪ 2 مدرسوں میں۔ ہم ساری توانائیاں صرف ٪ 2 بچوں کو کامل مسلمان بنانے میں صرف کر دیتے ہیں اور ٪98 بچوں کو عیسائی طرز فکر کے اسکولوں اور دہریوں کے حوالے کر دیتے ہیں۔ کیوں نہیں ہم ان ٪ 98 بچوں کی اسلامی ماحول میں تربیت کی فکر کرتے ہیں؟ کیوں نہیں ہم انھیں پہلے ایک سچا اور پکا مسلمان بناتے ہیں؟ ہمارا بچہ اگر انجینیر ہو تو پہلے ایک پکا مسلمان بھی ہو۔ ڈاکٹر ہو تو اس کے ساتھ ایک پختہ مسلمان بھی۔

چھوٹی چھوٹی پارٹیاں مسلمانوں کے لیے فائدہ مند یا نقصان دہ!

مسلمان تاریخ کا عامل بنیں یا معمول!

(۲۰۱۴ء میں لکھی گئی ایک یادگار تحریر)

یہ وقت کا انتہائی حساس ترین موضوع ہے جس کو روزنامہ انقلاب کے ذریعہ اٹھایا گیا ہے یہ قضیہ بھی حقیقۃً مسلم قیادت ہی کے مسئلہ سے جڑا ہوا ہے۔ در اصل مسلمان اس وقت ہندوستان میں انتہائی بے کسی اور درماندگی کی زندگی گزار رہا ہے۔ شعوری طور پر پوری منصوبہ بندی کے ساتھ یہاں کا حکمراں و غیر حکمراں طبقہ مسلمانوں سے اس ہزار سالہ حکومت کا انتقام لے رہا ہے جو مسلمانوں نے غیر معمولی شان و شوکت کے ساتھ یہاں کی تھی۔ یہاں کے بیدار مغز غیر مسلم قائدین مسلمانوں کے تابناک ماضی سے لرزاں و ترساں ہیں کہ کہیں ان کا روشن ماضی پھر سے اپنے مستقبل کی تعمیر کے لیے مہمیز نہ کرے۔ اس لیے اولا تو ہندوستان کی تاریخ بدلی گئی، حقائق پر پردے ڈالے گئے۔ اب جدید ہند کی تاریخ ۱۹۴۷ء سے شروع ہوتی ہے نہ کہ ۱۲۰۶ء سے۔ دوسرے مرحلے میں تقسیم ہند کے بعد مسلمانوں کی جو بھی شیرازہ بندی تھی اسے پاش پاش کیا گیا، تاکہ مسلمان سیاسی طور پر کبھی اس قابل نہ ہو سکیں کہ ان کی رسائی حکومت تک ہو۔ اس بات کو تقویت اس امر سے بھی ملتی ہے کہ ہندوستان کے اندر مسلمان ۳۰ر کروڑ کی تعداد میں ہونے کے باوجود بھی ملک گیر سطح پر کسی پارٹی کی تشکیل میں اب تک ناکام رہے، جب کہ غیر مسلموں نے تقسیم کے بعد بھی بہت سی پارٹیاں بنائیں اور وہ برسر اقتدار بھی ہوئیں مثلا: بی جے پی، بی ایس پی، ایس پی، آر جے ڈی، جے ڈی یو وغیرہ۔

آخر ایسی پارٹیاں مسلمانوں کے ذریعہ کیوں وجود میں نہ آسکیں؟ اس کی ایک بنیادی وجہ تو یہ ہے کہ اتنا ستائے جانے کے بعد بھی مسلمانوں کو اب تک ہوش نہیں آیا کہ وہ کسی ایک شخص کو اپنا قائد اور کسی ایک مسلم پارٹی کو مسلمانوں کی نمائندہ پارٹی دل سے تسلیم کرلیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ متبادل قیادت نہ ہونے کی وجہ سے مسلمانوں نے جہاں چاہا اپنا سر چھپالیا، جس پارٹی سے ان کو مادی فائدہ حاصل ہوا اس سے منسلک ہوگئے۔ جو مسلمانوں میں زیادہ باہمت نکلے انھوں

نے چھوٹی چھوٹی پارٹیاں بنالیں جو صوبائی سطح پر کبھی مؤثر نہ ہوسکیں۔

ایسی صورت حال میں مسلمانوں کے پاس صرف دو ہی راستے ہیں: ایک راستہ یہ ہے کہ مسلمان تاریخ کا عامل بن جائے اور مسلمانوں کے ہر مکتب فکر و مسلک کے تھنک ٹینک ،مسلک وگروہ بندی سے بالاتر ہوکر سیاست کے ایک فلیٹ فارم پر آکر اشتراک عمل کے ساتھ کسی نیشنل پارٹی کی تشکیل عمل میں لائیں اور ملک کے سارے مسلمان کم ازکم اس کے بینر تلے جمع ہوں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ مسلمان تاریخ کا معمول بن کر دوسری پارٹیوں کے لیے صرف ووٹ بینک بنا رہے۔ مؤخر الذکر صورت میں اگر مسلمانوں کو ان کے تمام حقوق نہیں مل رہے ہیں یا ان کے ساتھ مساوات کا برتاؤ نہیں کیا جارہا ہے تو انھیں شکوہ نہیں کرنا چاہیے؛ کیوں کہ یہ صورت حال خود ان کی اپنی Choice ہے۔

مسلمانوں کی اکثریت اس امر پر متفق ہے کہ خود مسلمانوں کی ایک مضبوط نیشنل پارٹی ہونی چاہیے تاکہ متبادل قیادت انھیں مل سکے۔ رہی چھوٹی چھوٹی پارٹیاں تو اس سے کسی نتیجہ خیز امر کی توقع بعید معلوم ہوتی ہے۔ خداحافظ

حضور اکرم ﷺ اور طاقت کا استعمال

محمد رضا قادری مصباحی
پرنسپل: جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء ذاکر نگر

قرآن کریم عالمی توازن میں حق کی تائید کے لیے قوت کے استعمال کی تاکید کرتا ہے اور قوت کے استعمال کا محل بھی بتاتا ہے۔ جہاد اسلام میں مشروع ہے اور رسول اکرم ﷺ کے پیغامِ رسالت میں بھی جنگ مشروع ہے۔انجیل میں آپ کے مذکورہ اوصاف میں یہ بھی ہے کہ آپ "صاحب القضیب"یعنی صاحب شمشیر ہوں گے، آپ حق کو پھیلا ئیں گے، لیکن اگر حق کی اشاعت میں رکاوٹیں کھڑی کی گئیں تو آپ ﷺ طاقت اور تلوار کو بھی استعمال کریں گے۔اس کا یہ مطلب ہرگز نہ لیا جائے کہ آپ تشدد سے کام لیں گے۔آپ ﷺ اپنی امت کو اس قدر مضبوط دیکھنا چاہتے تھے کہ بین الاقوامی توازن میں اس کا لحاظ رکھا جائے اور اس کی گرفت سے ڈرا جائے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر آپ اس قدر طاقتور نہیں ہوں گے تو عالمی توازن میں کوئی موثر رول نہیں ادا کرسکتے۔ دوسری طاقتور مملکتیں آپ کی پرواکیے بغیر فیصلے کرنے لگیں گی۔اور آپ کو ان کے فیصلے پر مجبور ہونا پڑے گا۔آج امت مسلمہ عالمی طاقت کے توازن میں کوئی بھی موثر کردار کے ادا کرنے سے قاصر ہے یہی وجہ ہے کہ بڑی طاقتیں ان کا استحصال کررہی ہیں اور ان کو اپنا لقمۂ تر سمجھتی ہیں۔

اگر مسلم ممالک طاقتور ہوتے تو افغانستان ،عراق، لیبیا، تیونس اور شام پر طاقتور قوتین جنگ مسلط نہ کر پاتیں۔ان تمام صورت حال کا سبب یہ ہے کہ بڑی طاقتوں کے مقابلہ میں بین الاقوامی توازن کے لیے آپ کے پاس مناسب قوت اور وزن نہیں ہے۔ جبکہ اللہ تعالی فرماتا ہے :وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكَافِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا (النساء:۱۴۱) خدائے تعالی ہر گز کافروں کو مومنوں پر غلبہ نہیں دے گا۔اس کا مطلب یہ ہے کہ کافر مومن حقیقی پر حکمرانی نہیں کرسکتا اور اگر کررہا ہے تو وہ ان کے ایمان کا قصور ہے۔رسول اعظم ﷺ نے ان کو طاقت کے استعمال کا صحیح طریقہ بتلایا۔اور فرمایا قوت کا استعمال ہمیشہ ظلم کے خاتمہ

اور عدل و انصاف کی بالا دستی کے لیے ہونا چاہیے۔اسلام میں جنگ کی حیثیت عمومی نہیں ،بلکہ استثنائی ہے۔جنگ دفاع کے لیے ہے اِقدام کے لیے نہیں۔جنگ امن بر پا کر نے کے لیے ہے تشدد اور تخویف کے لیے نہیں۔رسول اکرم ﷺ نے فرمایا جنگ صرف مقاتلین (لڑنے والوں) سے کی جائے گی۔اللہ تعالی کا فرمان ہے : اُذِنَ لِلّذِیْنَ یُقَاتِلُونَ بِاَنّھُمْ ظُلِمُوْاوَاِنَّ اللّٰہَ عَلیٰ نَصرِھِمْ لَقَدِیْر۔اَلّذِیْنَ اُخْرِجُوا مِنْ دِیَا رِھِم بِغَیْرِ حَقّ اِلّا اَن یّقُولُوا رَبُّنَا اللّٰہُ(الحج:۳۹۔۴۰)جن مسلمانوں سے لڑائی کی جاتی ہے ان کو اجازت ہے کہ وہ بھی لڑیں کیونکہ ان پر ظلم ہو رہا ہے۔اور یقینا خدا ان کی مدد پر قادر ہے ۔یہ وہ لوگ ہیں کہ اپنے گھروں سے ناحق نکال دیئے گئے صرف یہ کہنے پر کہ ہمارا رب اللہ ہے۔

صحابہؓ کرام کو طرح طرح کے ظلم وستم کا نشانہ بنایا گیا تھا یہاں تک کہ جینے کے حق سے محروم کر دیا گیا تھا اور انہیں طرح طرح کی تکلیفیں پہونچا کر جان سے مار ڈالا گیا۔

رسول اکرم ﷺ نے ۱۸ غزوات میں شرکت فرمائی جس میں مسلمان شہداء کی تعداد ایک سو سے کچھ زائد ہے اور کافروں کی تعداد ہزار کے قریب۔اتنا بڑا جمہوری و انسانی انقلاب لانے کے لیے اتنے کم لوگ مارے گئے جبکہ دوسری جنگ عظیم میں مرنے والوں کی تعداد چالیس ملین (چار کروڑ) ہے اور روس میں صرف ایک نظام ،سوشلزم کو رائج کرنے کے لیے دس کروڑ لوگوں کی جانیں گئیں۔یہ اتنی بڑی تعداد ہے کہ ان کے خون میں کشتیاں چلائیں اور ان کی کھوپڑیوں سے بڑی بڑی عمارتیں تیار کی جائیں۔جب کہ یہ ایک غیر فطری اور باطل نظام تھا جسے دنیا آج رد کر چکی ہے۔ان جنگوں کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ،آپ ﷺ کے ذریعہ جمہوریت ، انسانی حُرّیت اور مساوات کا جو غیر معمولی انقلاب آیا وہ سراسر غیر خونی انقلاب تھا۔اس میں کافروں کی طرف سے وہ لوگ مارے گئے جو انسانیت کے دشمن تھے اور انسان کو غلام بنائے ہوئے تھے ،جبکہ ان کی ماؤں نے ان کو پیٹ سے آزاد جنا تھا غزوۂ بدر ، غزوۂ احد، غزوۂ خندق اور غزوۂ حنین وغیرہ کی پوری تاریخ اٹھا کر دیکھ لیجیے ان جنگوں میں مسلمانوں کو اپنے وجود کی بقا اور اپنے مذہب کے دفاع کے لیے میدان میں آنا پڑا۔کفار مٹھی بھر بے اسلحہ مسلمانوں کے وجود کو سرے سے ختم کر دینا

چاہتے تھے۔اگر دفاعی جنگ کے ذریعہ مسلمانوں کو بچایا نہیں جاتا تو دنیا آج تک حقیقی جمہوریت کی قدروں سے روشناس نہ ہو پاتی۔

رسول اعظم ﷺ اپنی امت کو اس اعلیٰ ترین مقام پر پہونچانا چاہتے تھے جہاں سے یہ پوری مظلوم انسانیت کی مدد کر سکے ، اور بغیر کسی رکاوٹ کے توحید کی بادنسیم ہر خاص و عام تک پہونچ سکے۔حصول طاقت کے نقطۂ نظر سے ذرا اس آیت کو ملاحظہ کریں: **وَاَعِدّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ** (الانفال:۶۰) اور جہاں تک ہو سکے (فوج کی جمعیت کے) زور سے اور گھوڑوں کے تیار رکھنے سے ان کے (مقابلے کے) لیے مستعد رہو تاکہ اس کے ذریعہ اللہ کے دشمن اور اپنے دشمنوں پر رعب طاری کر سکو۔عہد رسالت مآب ﷺ کے مسلمانوں نے یہ بات بخوبی سمجھ لی تھی جبھی توفاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں جنگ میں شریک گھوڑوں اور اونٹوں کے علاوہ گھوڑوں کی ایک بڑی تعداد ایسی تھی جسے جنگ میں استعمال نہیں کیا جاتا تھا۔مثلاً مدینہ سے باہر چراگاہ میں چالیس ہزار گھوڑے تیار رہتے تھے ،جنھیں جنگ میں استعمال نہیں کیا گیا تھا۔اسی طرح ہنگامی حالات کے لیے چالیس ہزار گھوڑے شام کی سرحد پر موجود رہتے۔

چونکہ اس زمانے میں گھوڑے اور تلواریں فوجی قوت کے اعلیٰ ترین وسائل تھے (جیسے آج میزائیل اور ٹینک ہیں)جسے صحابہ کرام نے انتہائی احتیاط اور حکمت عملی کے ساتھ اختیار کیا۔آج کے زمانے میں قوت کا معیار بدل چکا ہے اس کی جگہ جدید اسلحے اور اعلیٰ ترین جنگی میزائیل اور میزائل شکن طیاروں نے لے لی ہے۔

اگر ہم نے اِعداد قوت کے لیے جدید جنگی تدابیر اختیار نہ کیے تو طاقت کا توازن ہرگز قائم نہیں رکھ سکتے ،بلکہ غیر متوازن طاقت کے سبب دنیا بھیانک جنگ کی چکی میں پس سکتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ اسرائیل غزہ پر بمباری کرتا ہے اور وہاں کے نہتے شہری ان پر پتھراؤ کرتے ہیں۔اس بات کو مسلم برادری اچھی طرح سمجھ لے کہ کسی بھی پائیدار امن کے لیے ،ظلم کا خاتمہ کرنے کے لیے طاقت کا حصول اسلامی اور عسکری نقطۂ نظر سے ناگزیر ہے۔اسلام پر کسی وار اور خودکش بم حملوں کی ہرگز ہرگز حمایت نہیں کرتا۔

مسلم معاشرہ میں طلاق کے بڑھتے رجحانات

از مفتی محمد رضا مصباحی

مطبوعہ: سہ ماہی، الہادی، نیپال۔ مئی تا اکتوبر ۲۰۱۵ء

آج کا مسلمان ہر موڑ پر بے اعتدالی کا شکار ہے۔ ایک اعتدال پسند زندگی کا تصور ان کے یہاں مفقود ہوتا جارہا ہے۔ عائلی سطح پر آج کا مسلمان سب سے زیادہ پریشان ہے۔ باپ، بیٹے، بھائی، بہن اور بیوی وشوہر کے درمیان ذہنی ہم آہنگی نہ ہونے کی وجہ سے گھر کا گھر جہنم کا ایندھن بن چکا ہے۔ اخلاقی قدروں کی پامالی کی انتہا نہ رہی۔ بے شمار معاشرتی مسائل میں سے ایک اہم ترین مسئلہ جس نے خاندانوں اور قبیلوں کو بے چین کر رکھا ہے مسلم معاشرہ میں طلاق کے بڑھتے ہوئے رجحانات بھی ہے۔ طلاق جس کی شرعی حیثیت اسلام میں ابغض مباحات کی ہے۔ اس کو مسلمانوں نے ایسر مباحات سمجھ لیا ہے۔ یعنی جائز امور میں سب سے آسان، یہ ایک تشویش ناک پہلو ہے جس کے اسباب اور تدارک کے ذرائع پر غور کرنا وقت کا جبری تقاضا بن چکا ہے۔ طلاق سے نہ صرف یہ کہ ایک فرد متاثر ہوتا ہے، بلکہ دونوں خاندان یقینی طور پر متاثر ہوتے ہیں اور فیملی کے درمیان ہمیشہ کے لیے ناخوش گوار تعلقات قائم ہوجاتے ہیں۔ عام حالات میں یہ زیادتی مردوں کی طرف سے زیادہ پائی جاتی ہے، جو آگے چل کر دشمنی میں تبدیل ہوکر تباہی کا سبب بنتے ہیں۔

اسلام نے امت مسلمہ کو ہمیشہ منفی سوچ (Negative Thinking) سے بچایا ہے اور مثبت سوچ (Possitive Thinking) کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ اور ہمیشہ اعتدال کی حالت میں رہنے کی تلقین کی ہے: وَجَعَلْنٰکُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَکُوْنُوْا شُهَدَاءَ عَلَی النَّاسِ اور ہم نے تمھیں اعتدال پسند امت بنایا تاکہ لوگوں پر گواہ ہوجاؤ۔ امن کا تقاضا یہ ہے کہ مشتعل کرنے والے حالات میں بھی مومن کی سوچ اور ان کا عمل حد سے تجاوز نہ کرے۔ نکاح جوڑنے کا عمل ہے اور طلاق توڑنے کا عمل، نکاح تعمیری و مثبت فکر کا غماز ہوتا ہے اور طلاق عموماً تخریبی اور منفی فکر کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ نکاح اس لیے نہیں کیا جاتا کہ اسے ختم کردیا جائے بلکہ اس سے خاندان، سماج اور ملک کی تعمیر کی جاتی ہے۔

اسباب: سو فیصدی حالات کا ناموافق ہونا ہے۔ غصہ، اشتعال، مایوسی، بزدلی، احساسِ محرومی، حرص و

طمع یہی وہ چیزیں جو اکثر حالات میں انسان کو طلاق جیسی مبغوض امر کے ارتکاب پر مجبور کرتی ہیں۔ کوئی بھی انسان خوشی کی حالت میں طلاق نہیں دیتا ہے، بلکہ طلاق ہمیشہ عمل یا ردعمل کا نتیجہ ہوتی ہے۔ غلطی تو انسان سے ہی ہوتی ہے۔ فرشتے اس سے مستثنیٰ ہیں۔ شوہر سمجھنے لگتا ہے کہ میری زوجہ کے اندر صد فیصد فرشتوں جیسی صفات پیدا ہو جائیں اور اس سے کوئی غلطی صادر ہی نہ ہو لہٰذا ذرا بھی خلاف مزاج کوئی بات سامنے آئی فوراً اس پر جذباتی ہو کر مشتعل ہو گئے اور ایک دو تین گولیاں داغ دیں۔ کبھی مرد اس خوش فہمی میں جیتا ہے کہ سامان جہیز میں یہ یہ سامان ملیں گے اور جب سامان جہیز اس کی خواہش کے مطابق نہ ملے تو آتش انتقام بھڑک اٹھتی ہے اور احساس محرومی کے تحت جذبۂ انتقام میں طلاق کی حد تک پہنچ جاتا ہے جو انتہائی غیر سنجیدہ اور بزدلانہ عمل ہے۔ اسلام نے عورت کے گھر والوں پر اسباب جہیز فراہم کرنا لازم نہیں کیا ہے بلکہ آزاد چھوڑا گیا ہے۔ وہ اپنی بیٹی کو جتنا چاہے دے۔ اگر کوئی اپنی بیٹی کو سامانِ جہیز میں کچھ بھی نہیں دیتا پھر بھی مرد کے گھر والوں کو اعتراض کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ یہی کیا کم ہے کہ وہ اپنی نور نظر کو جسے اپنی آغوش شفقت میں پال پوس کر جوانی کی دہلیز تک پہنچایا جدا کر کے تمھارے گھر کی کنیز بنا رہا ہے۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ نکاح کے بعد مرد کو معلوم ہوتا ہے کہ لڑکی حسن و جمال، علم و فضل کے اعتبار سے اس سے کمتر ہے جب کہ اس کے ذہن میں ایک حسین و جمیل، تعلیم یافتہ دوشیزہ کی تصویر بیٹھی ہوئی ہے۔ اب وہ اسے اپنی طبیعت کے موافق نہ پاکر طلاق کا ارادہ کر لیتا ہے۔ کم ہی مرد اس راز سے واقف ہیں کہ حسن و جمال یا علم و فضل یہ اضافی امر ہیں بعض میں زیادہ اور بعض میں کم ہوتا ہے۔ انسان اس دنیا میں ہر چیز اپنی خواہش کے مطابق نہیں پاسکتا، یہ امکان صرف جنت کی زندگی کے لیے خاص ہے۔ دنیا کی زندگی میں اکثر واقعات توقع کے خلاف واقع ہوتے ہیں۔ دنیا کی زندگی میں کامیابی کا راز صرف صبر و قناعت ہے۔ اور اللہ کی ذات پر کامل توکل کر کے اس کے حق میں اللہ تعالیٰ نے جو بھی فیصلہ فرمایا ہے وہ حقیقت کے اعتبار سے صحیح ہے، اگرچہ بظاہر اسے صحیح معلوم نہ ہوتا ہو۔

ساس اور بہو میں تنازع: بسا اوقات ساس اور بہو کے درمیان تنازعات بھی طلاق کا سبب بن جاتے ہیں۔ جب کوئی بہو میکے سے بیاہ کر سسرال کو آتی ہے تو سب سے زیادہ سابقہ اسے ساس سے پڑتا ہے۔ کام کاج کے معاملات میں ساس اپنے ذہن میں یہ تصور بٹھائے ہوتی ہے کہ آنے والی بہو انتہائی تجربہ کار، ہوشیار، خدمت گزار اور اطاعت شعار ہوگی۔ اس سے کسی معاملے میں غلطی سرزد نہیں ہو سکتی، جب کہ آنے والی بہو اپنی عمر، علم اور تجربے کے اعتبار سے انتہائی نامکمل ہوتی ہے۔ ابھی وہ پچاس سال کی عمر کو نہیں پہنچی ہے کہ پچاس سالہ خاتون جیسا تجربہ ہو، اس

سے قدم قدم پر غلطیاں سرزد ہوتی ہیں، گھر کے معاملات کو سمجھنے میں وقت لگتا ہے۔ ابتدا سے ہی اسے مختلف امور کے انجام دہی کی عادت نہیں ہوتی ہے، عادت بنانی پڑتی ہے۔ اب ساس ہے جو ایک پیمانہ لیے کھڑی ہوئی ہے کہ ذرا بھی اس پیمانہ سے انحراف ہوا تو عذاب وتشدد بہو کے لیے لازم ہوجائے گا۔ یہاں ساس کو تحمل وبردباری سے کام لے کر بہو کو تمام کاموں کی ٹریننگ دینے کی ضرورت ہے۔ اسے امور خانہ داری میں ہور ہی غلطیوں سے آگاہ کرنے کی ضرورت ہے نہ کہ اس سے انتقام لینے کی۔

بیٹی اور بہو میں فرق: آج جو خاتون کسی کے گھر میں بیٹی کا درجہ لیے ہوتی ہے آخر ش وہ کسی گھر میں بہو کی حیثیت بھی حاصل کرے گی۔ شادی شدہ خاتون ایک اعتبار سے بہو اور دوسرے اعتبار سے بیٹی ہوتی ہے۔ ساس کے لیے یہ غور کرنے کا مقام ہے کہ وہ بہو کو بیٹی کا مقام دے پاتی ہے یا نہیں، اگر ایک چارپائی پر ساس بیٹھی ہو اور اس پر اس کی بیٹی آکر اس کے سامنے لیٹ جائے، تو ماں کو اس سے کوئی ناگواری نہیں ہوتی ہے مگر بیٹی کی جگہ اگر بہو آکر لیٹ جائے تو ساس مشتعل ہوجاتی ہے اور بگڑنے لگتی ہے۔ وہ اس کو اپنے لیے موت وحیات اور عزت وذلت کا مسئلہ بنا لیتی ہے۔ نظریات میں اس فرق کی بنا پر ساس اور بہو میں ہم آہنگی اور محبت کی فضا قائم نہیں ہوپاتی۔

عجیب جاہلانہ رسم سماج میں جڑ پکڑ چکی ہے کہ ساس پہلے کھانا کھائے گی اور بہو بعد میں اگر بہو نے پہلے کھانا تناول کر لیا تو ساس چراغ پا ہوجاتی ہے۔ پھر ایک ساتھ بیٹھ کر اکل وشرب کا ماحول نہ ہونا بھی آپس میں کشیدگی کا باعث بنتا ہے۔ اب ساس اپنے بیٹے سے بہو کی بے جا شکایتوں میں لگ جاتی ہے اور بہو بھی مشتعل ہو کر جواب الجواب شروع کر دیتی ہے۔ رفتہ رفتہ گھر کا اندرونی ماحول کشیدہ ہوتا چلا جاتا ہے اور اس کی انتہا زن وشوہر کے درمیان فرقت پر ہوتی ہے۔ ایسے جاہلانہ سوچ اور رسوم ہمارے سماج کے لیے سم قاتل کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس سے بچنے اور بچانے کی ضرورت ہے۔

میکے والوں کی طرف سے بیٹی کی حوصلہ افزائی: بعض اوقات لڑکی کے گھر والے بھی طلاق کی راہ کو ہموار کرنے میں مددگار ہوتے ہیں۔ اپنی بیٹی کی غلطیوں کو نظر انداز کرنا، تنبیہ نہ کرنا، بلکہ اس کی پشت پناہی کرنا اس کے حوصلوں کو بڑھاتا ہے۔ ایسے موقع پر میکے والوں کو چاہیے کہ وہ بیٹی سے صاف کہہ دیں کہ یہ تیرا گھر نہیں ہے بلکہ تیرا حقیقی گھر سسرال ہی ہے۔ اب تمھیں ہی وہاں کے حالات کو موافق بنانا ہوگا۔ سسر، ساس اور شوہر کی خدمت واطاعت میں ہی تمھاری کامیابی مضمر ہے۔ ان کی رضا حاصل کرو اور ان کی اطاعت شعاری میں زندگی گزارو۔ میکے والوں کی طرف سے بے جا امداد، حوصلہ افزائی یہ سب لڑکی کے لیے بڑی ہی نقصان دہ ہے۔

اعتقادی، کلامی اور

فقہی مضامین

جشنِ عید میلادالنبی ﷺ اور (معمولاتِ اہلِ سنت)

محمد رضا قادری مصباحی
پرنسپل: جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء، ذاکر نگر، نئی دہلی۔۲۵

ولادتِ طیّبہ:

وجہِ تخلیق کائنات، پیغمبر اسلام، حضرت محمد رسول اللہ ﷺ (ولادت: ۲۰/اپریل ۵۷۱ء وصال مبارک: ۱۱ھ ۱۲/ جون۶۳۲ ء)کی ولادت باسعادت ۱۲/ربیع الاول بوقت صبح صادق ، بروز دوشنبہ کو مکہ مکرمہ میں ہوئی۔سب سے قدیم ومستند سیرت نگار، محمد بن اسحٰق بن یسار (ولادت: ۸۵ھ وصال ۱۵۱ھ) نے یہی دن اور یہی تاریخ لکھی ہے۔مشہور مؤرخ ابو جعفر طبری (وفات: ۳۱۰ھ) اور معروف سیرت نگار علامہ احمد بن محمد قسطلانی(ولادت: ۸۵۱ھ وفات: ۹۲۳ھ) نے بھی اسی کو مشہور لکھا اور ابو القاسم عبد الرحمن سُہیلی (وفات: ۵۱۸ھ) نے اسی کو مختار سمجھا ہے۔حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ حضور ﷺ سے دوشنبہ کے دن روزہ رکھنے کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ نے ارشاد فرمایا:''ذَاکَ یَومٌ وُلِدَتُ فِیہِ ، وَاُنزِلَت علیّ فِیہِ النُّبوَّۃُ''اسی دن میں پیدا ہوا اور اسی دن مجھ پر وحی نازل ہوئی۔ (صحیح مسلم، حدیث ۱۹۷، کتاب الصیام)

اس مبارک ومسعود موقع پر بلادِ عرب وعجم ، حجازِ مقدس، یمن شام، مصر، ترکی، لیبیا، عراق، افغانستان، سمرقند وبخارا اور متحدہ ہندوستان ودیگر بلاد اسلامیہ میں قدیم روایات کی طرز پر آج بھی محافلِ ذکر ولادت کا انعقاد ہوتا ہے، جن میں ولادتِ رسول، فضائلِ رسول، سیرتِ رسول اور دعوتِ رسول کا بیان ہوتاہے اور مسلمان ذوق وشوق کے ساتھ انہیں سنتے اور سناتے ہیں۔اظہارِ مسرت اورادائے شکر نعمت کے لئے صدقہ وخیرات کرتے ہیں اور یہ ساری چیزیں کتاب وسنت کی روشنی میں نہ صرف جائز بلکہ محمود ومستحسن ہیں۔دین میں ان کی اصل اور حکم ہے اور ہر دور کے لحاظ سے اہل اسلام یہ امور انجام دیتے رہے ہیں، جائز حدود کے اندر رہتے ہوئے شکل وہیئت کی تبدیلی سے اصلِ حکم پر کوئی اثر اور فرق واقع نہیں ہوتا۔

ذکرِ ولادت مصطفی ﷺ اور اس مناسبت سے محافل ومجالس کا انعقاد ، دعوتوں کا اہتمام ، اظہار فرح وسرور، صدقہ وخیرات، جائز حدود میں رہتے ہوئے جلوس نکالنا اور گلی کوچوں میں چراغاں کرنا، نہ صرف جائز ،بلکہ محمود ومستحب ومطلوب عمل ہے۔شرع مطہر میں اس کے مذموم وممنوع ہونے پر کوئی نص وارد نہیں بلکہ بیسیوں نصوص ان کے جواز کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

ولادتِ طیبہ پر خوشیاں منانے کا ذکر قرآن میں:

اللہ تعالی کاارشاد ہے: **قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ** تم فرماؤ اللہ ہی کے فضل اور اسی کی رحمت اوراسی پر چاہیئے کہ خوشی کریں اور وہ ان کے سب دھن دولت سے بہتر ہے۔(یونس: ۵۸)اس آیۂ کریمہ میں رحمت اور فضل پر خوشیاں منانے کا حکم آیا ہے،ذات مصطفی ﷺ سے بڑھ کر مومن کے لیے اور کون سی نعمت اور رحمت ہے کہ اس پر خوشیاں نہ منائی جائیں؟**وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ** ، ہم نے آپ کو سارے جہان کے لیے رحمت بناکر بھیجا۔

سورۂ اعراف میں فرمایا:اللہ کی نعمتوں کا چرچا کرو تاکہ تم فلاح پاؤ(اعراف،۶۹)اللہ تعالی نے نعمتوں کے دنوں کو یادگاردن کے طور پر منانے کا حکم خود دیا ہے ارشاد ہے''**وَذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰمِ اللّٰهِ** اور انہیں اللہ کے دنوں کی یاد دلاؤ۔ (ابراہیم،۵)

ایام اللہ کی تفسیر میں حضرت ابن عباس، ابی ابن کعب ، مجاہد اور قتادہ رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں یعنی بنعم اللہ یعنی اللہ کی نعمتوں کے دنوں کو یاد کرو۔(تفسیر خازن جلد ثالث) پس شکل اول کی ضرب اول سے نتیجہ نکلا کہ سرکار دوعالم ﷺ کا یوم ولادت منانا واجب ہے، اس لئے کہ امر کا ایک درجہ احناف کے یہاں وجوب بھی ہے اور کم از کم استحباب تو ہے ہی۔ انبیائے کرام کے یوم ولادت منانے کا ذکر نہ صرف یہ کہ ہماری شریعت میں ہے بلکہ شریعت موسوی میں بھی اس کا ذکر ملتا ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:**وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ**''اورجب موسی نے کہا اپنی قوم سے،

اے میری قوم ، اللہ کا احسان اپنے اوپر یاد کرکہ تم میں سے پیغمبر کیے۔(مائدہ۲۰) اس آیت سے معلوم ہوا کہ پیغمبروں کی تشریف آوری نعمت ہے اور حضرت موسی علیہ السلام نے اپنی قوم کو اس نعمت کے یاد کرنے کا حکم دیا کہ وہ برکات وثمرات کا سبب ہے۔ نفسِ ذکر ولادت طیبہ میں تو کسی کو کلام نہیں، کلام اس میں ہے کہ دن اور تاریخ مُعَیّن کرکے یاد گار کے طور پر مجالس ومحافلِ میلاد منعقد کرنا، شریعت میں اس کی کوئی اصل ہے یا نہیں؟ اصل بات یہ ہے کہ یہ نسبتوں کا معاملہ ہے ۱۲/ ربیع الاول کی تاریخ میں ذکرمیلاد اس عہد کی یاد کی تجدیدوتذکیرہے اور اسے تا زہ کرنا ہے ۔جیسے معین تاریخ وماہ میں حاجی کا صفاومروہ کی سعی اور میلینِ اَخضرین کے درمیان سعی میں تیز رفتاری ،حضرت ہاجرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے عمل کی یادگارہے۔اس سلسلے میں درج ذیل روایت کو غور سے ملاحظہ کریں:

بخاری ومسلم کی روایت

صحیح بخار وصحیح مسلم میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول ﷺ جب مدینہ تشریف لائے، یہود کو عاشورہ کے دن روزہ رکھتے ہوئے پایا۔ارشاد فرمایا: یہ کون ساد ن ہے کہ تم روزہ رکھتے ہو؟ عرض کی: یہ عظمت والا دن ہے کہ اس دن موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کو اللہ تعالی نے نجات دی۔فرعون اور اس کی قوم کو ڈبودیا۔آپ نے فرمایا موسیٰ علیہ السلام کی موافقت کرنے میں بہ نسبت تمھارے ہم زیادہ حقدار اور زیادہ قریب ہیں۔تو حضور ﷺ نے خود بھی روزہ رکھا اور اس کا حکم بھی دیا۔اس سے معلوم ہواکہ جس دن اللہ تعالی کوئی نعمت عطا کرے اس کی یادگار قائم کرنا درست اور محبوب ہے۔

اسی حدیث پاک سے علامہ ابن حجر عسقلانی (وفات:۸۵۲ھ) نے معین دن میں میلاد منانے کی اصل کا استخراج فرمایا ہے۔قرآن مجید میں حضرت یحییٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے میلاد کا ذکر ان لفظوں میں آیا ہے:''وَسَلَامٌ عَلَيۡهِ يَوۡمَ وُلِدَ وَيَوۡمَ يَمُوۡتُ وَيَوۡمَ يُبۡعَثُ حَيًّا'' اور سلامتی ہے اس پر جس دن پیدا ہوا اور جس دن مرے گا اور جس دن زندہ اٹھا یا جائے گا۔(مریم، آیت۱۵) اور حضرت عیسٰی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ولادت طیبہ کا ذکر اس طرح آیا

ہے: ''وَالسلام علیّ یَوم ولِدْتُّ وَیَوْمَ اَمُوْتُ وَیَوْمَ اُبعَثُ حَیّا''اور سلامتی مجھ پر جس دن پیدا ہوا اور جس دن مروں اور جس دن زندہ اٹھا یا جاؤں۔(مریم، آیت۳۳) ہاں ہیئتِ مخصوصہ کے ساتھ مجالس ومحافل کا انعقاد جیسا کہ ہمارے زمانے میں رائج ہے، ابتدائے اسلام کی کئی صدیوں میں اس کا رواج نہ تھا۔یہ بعد کی ایجاد ہے اور بدعت حسنہ کے زمرے میں شامل ہے۔اسے بدعتِ سیئہ و مذمومہ قرار دے کر ناجائز وحرام بتانا کھلی ہوئی گمرہی ہے کہ صدہا امور جن کا وجود عہدِرسالت ، بلکہ عہدِ صحابہ وتابعین میں نہ تھا آج وہ ہمارے لئے محبوب اور مستحسن بنے ہوئے ہیں۔خانۂ کعبہ پر غلاف ڈالنا، مساجد کو نقش ونگار سے مزین کرنا، مخالفین کی رد میں کتابیں لکھنا، مناظروں کے لئے جلسے اور حکم(پنچ) مقرر کرنا، جرح وتعدیل، اصول حدیث ، اصول تفسیر اور صرف ونحو کے اصول وضع کرنا اور فقہ اسلامی کی تدوین یہ سب نئی چیزیں ہیں جن کا وجود عہد رسالت بلکہ عہد صحابہ میں بھی نہیں تھا، مگر ساری دنیا اس پر متفق ہے کہ یہ جائز ہیں، عہد رسالت مآب ﷺ کے بعد جو نئی چیزعالم ظہور میں آئی اس کے صحیح وغلط ہونے کا معیار یہ ہے کہ شریعت کی اصل اور اس کے دائرہ میں ہو اور کسی اصل وحکم کے معارض ومتصادم نہ ہوتو جائز ہے ورنہ ناجائز۔اس لئے کہ بدعت کا جو مفہوم سرکار دوعالم ﷺ نے ارشاد فرمایا''مَن أَحْدَثَ فِی أَمْرِنَا مَا لَیْسَ مِنّا فَھُوَ رَدٌّ'' اس سے یہی مستفاد ہوتا ہے۔اور اگر مُحدَثَات کے لئے رد وقبول کا معیار کسی امر کا قرونِ ثلثہ میں ہونا یا نہ ہونا ہو تو دہلی سے سہارنپور تک مشہور مدارس میں ختم بخاری کے جلسے، تبلیغی جماعت کے سہ روزہ و چالیس روزہ چلے اور گشت، اور بعد نماز عصر بالالتزام تبلیغی نصاب وفضائل اعمال کا درس، ٹرین اور ہوائی جہاز سے سفر، جلسوں کے لئے اشتہار اور چندہ کے لئے رسیدات چھپوانا سب کو بدعت سیئہ کے خانہ میں ڈال کرناجائز سمجھاجانا چاہیے۔فیا للعجب!

میلادِ مصطفی علامہ ابن جوزی کی نظر میں:

اس سے ایک زینہ نیچے اتر کر فقہاو محدثین کرام کے ارشادات ومعمولات کی روشنی میں

قیامِ میلاد کا جائزہ ملاحظہ کیجیے:

مشہور محدث علامہ ابو الفرح عبد الرحمن ابن جوزی (وفات: ۵۹۷ھ) فرماتے ہیں:جو نبی کریم ﷺ کے میلاد پاک کی خوشی منائے تو وہ خوشی اس کے لئے دوزخ کی آگ سے پردہ بن جائے گی(اس کی اصل وہ حدیث ہے جو بخاری کتاب النکاح میں ہر دو شنبہ کو ابو لہب کے عذاب میں تخفیف کے حوالے سے منقول ہے کہ اس نے آپ کی ولادت پر خوش ہوکر اپنی باندی ثوبیہ کو آزاد کردیاتھا:مؤلف) اور جو میلادِ مصطفیٰ پر ایک درہم خرچ کرے حضور اس کی شفاعت فرمائیں گے جو قبول کی جائے گی۔"(مولد العروس)

مشہور محدث شارح ، بخاری علامہ احمد بن محمد قسطلانی(وفات: ۹۲۳ھ) فرماتے ہیں:حضور ﷺ کی ولادت کے مہینے میں اہل اسلام ، میلاد کی محفلیں منعقد کرتے چلے آرہے ہیں۔دعوتوں کا اہتمام اور شبِ ولادت میں صدقہ وخیرات ان کا معمول ہے۔اظہار فرح وسرور اور خوب نیکیاں کرتے ہیں۔ولادت طیبہ کے احوال پڑھتے پڑھاتے ہیں ،جس سے ان پر بڑی برکتیں نازل ہوتی ہیں۔(المواہب اللدنیہ ،ج اول ص۱۴۸)

مشہور محدث ومفسر علامہ جلال الدین سیوطی(وفات: ۹۱۱ھ) سے یوم میلاد منانے کے سلسلے میں کسی نے استفتا کیا اور اس کا حکم معلوم کرنا چاہا کہ وہ جائز ہے یا ناجائز، محمود ہے یا مذموم، اس کے کرنے پر ثواب ملے گا یا نہیں۔تو آپ نے اس باب میں ایک مستقل رسالہ"حسن المقصد فی عمل المولد"تصنیف کی۔آپ نے فرمایا میلادِ مصطفی کا عمل، جس میں لوگ اکٹھا ہوکر حسب استطاعت قرآن پڑھتے اور وقتِ ولادت کے احوال و واقعات بیان کرتے ہیں پھر دستر خوان بچھایا جاتا ہے اور کھانا کھاکر واپس ہوجاتے ہیں اور بس !اس کی اصل یہ ہے کہ یہ بدعتِ حسنہ ہے جس کا کرنے والا مستحق ثواب ہوتا ہے اور سب سے پہلے جس نے اس اہتمام کے ساتھ(سرکاری طور پر) محفل میلاد کی وہ شاہِ اربل، ابوسعید سلطان مظفر(م۶۳۰ھ) سلطان صلاح الدین ایوبی کا بہنوئی ہے۔

پھر فرماتے ہیں: ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے، كَانَ يَعْمَلُ الْمَوْلِدَ الشريف فی

رَبِیْعِ الاَوَّلِ وَیَحْتَفِلُ اِحْتِفَالًا ھَائِلاً

(الحاوی للفتاوی، ۱/ ۱۸۹۔ مطبوعہ ،دار الکتب العلمیۃ، بیروت: ۱۹۸۸ء)

جشن عید میلاد النبی ﷺ فقہا و محدثین کی نظر میں:

ان کے علاوہ جو علمائے اسلام مختلف ادوار میں میلاد منانے کے قائل اور اس پر عامل رہے ہیں ان میں سے چند مشاہیر کے نام ان کی کتابوں کے ساتھ ذیل کی سطور میں ملاحظہ کریں:

علامہ ابن حجر عسقلانی(وفات: ۸۵۲ھ) فتح الباری شرح صحیح البخاری، علامہ ابن حجر مکی ہیثمی(وفات: ۹۷۴ھ) فتاوی حدیثیہ ، شیخ محمد طاہر محدث پٹنی(وفات: ۹۸۶ھ) مجمع البحار جلد سوم، علامہ علی قاری(وفات: ۱۰۱۴ھ) نے جواز میلاد پر ۲۰/ دلائل پیش کیے اور مستقل کتاب "المولد الروی فی المولد النبوی ﷺ "تصنیف کی، امام ربانی مجدد الف ثانی شیخ احمد فاروقی سرہندی(وفات: ۱۰۳۴ھ) (مکتوبات شریفہ ج/ ۳) ، محقق علی الاطلاق شیخ عبد الحق محدث دہلوی(م ۱۰۵۲ھ) مدارج النبوۃ جلد دوم، آپ فرماتے ہیں: شب میلاد شب قدر سے افضل ہے(ماثبت بالسنۃ) ، شیخ محمد عبد الباقی زرقانی(وفات: ۱۱۲۲ھ) شرح المواہب اللدنیہ ج اول ، مجدد اعظم اعلی حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی حنفی(ولادت: ۱۲۷۲ھ وصال: ۱۳۴۰ھ) فتاوی رضویہ جلد یا زدہم ، علامہ شیخ یوسف بن اسماعیل نبہانی(وفات: ۱۳۵۰ھ) **حُجَّةُ اللّٰہِ عَلَی الْعَالَمِیْنَ فِی مُعْجِزَاتِ سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ۔**

ان کے علاوہ امام شمس الدین جزری(م ۶۶۰ھ) امام نووی(م ۶۶۵) اورامام شمس الدین ذہبی، امام ابن کثیر دمشقی (۸۴۲ھ) امام ابوذرعہ عراقی (م ۸۲۶ھ)اور امام شمس الدین سخاوی (م ۹۰۲ھ) وغیرہ ائمہ مسلمین نہ صرف میلاد مصطفی ﷺ کے جواز کے قائل رہے بلکہ اس باب میں کتابیں بھی تصنیف فرمائیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا معمول

اب ہم متحدہ ہندوستان کی ایک متفق علیہ شخصیت حضرت شاہ ولی اللہ محدث

دہلوی(ولادت: ۱۱۱۴ھ وفات: ۱۱۷۶ھ) کا قول پیش کردینا کافی سمجھتے ہیں جن کو موافق ومخالف سبھی مانتے اور ان پر اعتماد کرتے ہیں۔آپ فرماتے ہیں:

(ترجمہ) میں مکرمہ میں میلاد مصطفی ﷺ کے دن محفل میلاد میں تھا، اس وقت لوگ آپ پر درود شریف پڑھتے تھے، میں نے اس مجلس میں انوار وبرکات دیکھے تو تامل کیا۔ معلوم ہوا کہ یہ انوار ان ملائکہ کے ہیں جوان مجالس ومشاہد پر مقرر ہوتے ہیں اور میں نے دیکھا کہ انوار ملائکہ اور انوار رحمت آپس میں ملے ہوئے ہیں۔(فیوض الحرمین) (۱)

شاہ صاحب نے اپنے والد عبد الرحیم محدث دہلوی(ولادت: ۱۰۵۴ھ وصال: ۱۱۳۱ھ) کا معمول تحریر کیا ہے کہ وہ ہرسال میلاد پاک کے دن حضور علیہ السلام کے نام ایصال ثواب کیا کرتے تھے۔ایک سال کچھ نہ تھاتو انہوں نے بھنے ہوئے چنے ہی پیش کردیے۔(الدار الثمین فی مبشرات النبی الامین) (۲)

شاہ عبد العزیز محدث دہلوی کا معمول :

شاہ عبد العزیز محدث دہلوی(ولادت: ۱۱۵۹ھ،وصال: ۱۲۳۹ھ) کا معمول یہ تھا کہ آپ بارہ ربیع الاول کو لوگوں کو اکٹھا کرتے اور ولادت پاک کا ذکر کرتے، بعد ہ کھانا اور مٹھائی تقسیم کی جاتی۔(الدرّ المنظم ص۸۹) (۳)

حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کا معمول:

علمائے دیوبند کے شیخ ، مولوی اشرف علی تھانوی اور مولوی رشید احمد گنگوہی کے پیر ومرشد حاجی امداد اللہ حنفی، چشتی مہاجر مکی، رحمۃ اللہ علیہ(وفات: ۱۳۱۷ھ) جن کو علمائے دیوبند وسہارنپور بھی بالاتفاق اپنا مرجع ومقتدی مانتے ہیں فرماتے ہیں:" اس میں تو کسی کو کلام ہی نہیں کہ نفسِ ذکر ولادت شریف، حضرت فخر آدم، سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم موجب خیرات

(۱)فیوض الحرمین، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی
(۲)الدار الثمین فی مبشرات النبی الامین
(۳)الدر المنظم: شاہ عبد العزیز محدث دہلوی، ص ر ۸۹

وبرکات دنیوی و اخروی ہے۔

(فیصلہ ہفت مسئلہ۔پہلا مسئلہ مولود شریف ، مکتوب رحیمیہ ۷/۷ ۹طلاق محل کانپور)

ایک جگہ فرماتے ہیں: اور مشرب فقیر کا یہ ہے کہ محفل مَوْلِدْ میں شریک ہوتاہوں، بلکہ ذریعۂ برکات سمجھ کر ہرسال منعقد کرتا ہوں اور قیام میں لطف ولذت پاتا ہوں۔(مرجع سابق)

مولوی اشرفعلی تھانوی کا نظریہ:

شیخ مکی کی روشن تصریحات سے ان کا مشرب ومعمول اور محفل میلاد کا ذریعہ برکات ہونا خوب خوب آشکار ہوگیا۔اب اخیر میں مخالفین میلاد ومنکرین قیام وجلوس محمدی کے ایک عظیم مقتدی وپیشوا مولوی اشرف علی تھانوی(وفات: ۱۳۶۴ھ) مرید وخلیفہ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کا ایک قول نقل کرتے ہوئے اپنی بات ختم کرتا ہوں۔آیت کریمہ:

قل بفضل اللہ وبرحمتہ فبذالک فلیفرحوا ھو خیر مما یجمعون(سورہ یونس: ۵۸)

ترجمہ: تم فرماؤ اللہ کے فضل، اسی کی رحمت اور اسی پر چاہئے کہ خوشی کریں اور یہ ان کے سب دھن ودولت سے بہتر ہے۔

اس آیت کریمہ پر روشنی ڈالتے ہوئے مولوی اشرفعلی تھانوی نے لکھاہے:

بلا اختلاف حضور ﷺ اللہ تعالی کی سب سے بڑی نعمت اور اس کا کامل ترین فضل ہیں اس لئے اس آیت کریمہ سے بدلالۃ النص یہ مراد لیا جاسکتا ہے کہ یہاں رحمت اور فضل سے حضور مراد ہیں جن کی ولادت پر اللہ تعالی خوشی منانے کا حکم دے رہا ہے۔[1]

مذکورہ بالاتصریحات اور سلف وخلف کے روشن اقوال کو جان لینے کے بعد بھی اگر کوئی

(۱)مجموعہ خطبات، بنام میلاد النبی از:مولوی اشرفعلی تھانوی، ص۱۲۱—۱۲۰مطبوعہ جمیلی کتب خانہ لاہور۔

شخص میلاد مصطفی ﷺ منانے کو غیر اسلامی عمل اور مغربی اقوام کی پیروی سمجھتا ہے تو اسے از سر نو اپنے اسلام کو دریافت کرنے کی ضرورت ہے۔علی سبیل التنزل اگر نصوصِ کتاب وسُنّت میں صراحۃً یا اشارۃً اس کی کوئی اصل نہ بھی ہو جب بھی جمہورِ علمائے اسلام ومحدثینِ اَعلام وفقہائے شرق وغرب کا یہ عمل اس کے محمود و مستحسن ہونے کے لئے کافی ہے، اس لئے کہ سرکار دوجہاں ﷺ کا فرمان ہے **مَنۡ رَآہ المسلمُوۡنَ حَسَنًا فَهُوَ عِنۡدَ اللّٰهِ حَسَنٌ۔**

اللہ تعالی میلاد مصطفی وجلوس میلاد النبی ﷺ کے صدقہ وطفیل ہم تمامی اہلسنت کی مغفرت فرمائے۔اور دارین کی سعادتوں سے بہرہ ور فرمائے آمین۔

نوٹ: یہ مضمون غالباً ۲۰۱۱ء میں ربیع الاول شریف کے موقع پر کتابچہ کی صورت میں ۵/ہزار عدد چھاپ کر پورے اوکھلائی دہلی میں تقسیم کیا گیا تھا۔ (۱)

(۱) یہ تحریر دارالعلوم دیوبند کے مہتمم مولوی ابولقاسم نعمانی کی تحریر کے جواب میں لکھا گیا جس نے میلاد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم منانے کو عیسائیوں کے کرسمس ڈے منانے سے تشبیہ دی تھی اور اس کا انکار کیا تھا ۔جناب انعام الحق صاحب غفار منزل،اوکھلا،نے اپنے والد حاجی محمد عمر تیغی قادری مرحوم کے ایصال ثواب کے لیے اسے طبع کرایا تھا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نبیوں اور ولیوں سے استعانت کا جواز قرآن واحادیث کی روشنی میں

از قلم: محمد رضا قادری مصباحی
متخصّص فی الفقہ، جامعہ اشرفیہ، مبارک پور
مؤرخہ: ۱۳؍صفر المظفر ۱۴۲۹ھ بروز جمعہ

برادران اسلام!

بلا شبہ اللہ عزوجل ایک ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، وہی اس کائنات کا خالق اور مالک حقیقی ہے، وہی سب کا رازق اور حاجت روا ہے، اس کی اجازت کے بغیر کوئی پر بھی نہیں مار سکتا، مگر اللہ تعالی کے کچھ خاص بندے ایسے ہیں جن کو اللہ عزوجل نے اپنی صفات کا مظہر بنایا ہے، وہ خدا کی عطا سے انسان کی دستگیری اور مشکل کشائی بھی فرماتے ہیں اور جب کوئی مدد طلب کرتا ہے تو مدد بھی کرتے ہیں۔ خود قرآن مجید میں باری تعالی نے اپنے ان نیک بندوں نبیوں اور ولیوں سے مدد طلب کرنے کا حکم دیا ہے ارشاد ہے: **اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰہُ وَ رَسُوْلُہٗ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوا الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَ یُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَ ھُمْ رٰکِعُوْنَ۔** (اے مسلمانو!) تمھارے مددگار نہیں مگر اللہ اور اس کا رسول اور ایمان والے، جو نماز قائم کرتے ہیں اور زکوۃ دیتے ہیں اور اللہ کے حضور جھکے ہوئے ہیں۔ (سورہ مائدہ، ۵۵) اور دوسری جگہ ارشاد ہے: **و المؤمنون و المؤمنات بعضهم اولياء بعض**، اور مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں ایک دوسرے کے مددگار ہیں۔ (سورۂ توبہ، آیت: ۷۱)

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے لے کر آج تک امت مسلمہ کا یہی عقیدہ رہا ہے کہ اللہ کے نبیوں، رسولوں اور ولیوں سے مدد طلب کرنا جائز ہی نہیں بلکہ مستحسن ہے، جب کہ مانگنے والے کا عقیدہ یہ ہو کہ حقیقی امداد تو رب تعالی ہی کی ہے یہ مقدس نفوس خدا تک پہنچنے کا ذریعہ اور واسطہ ہیں۔ اس کی صفات کا مظہر ہیں۔ ان کے وسیلے سے دعا بھی کرسکتے ہیں اور ان

کو پکار بھی سکتے ہیں۔

مگر حوادث زمانہ کے ساتھ ساتھ بارہویں صدی ہجری سے لے کر اب تک کچھ ایسی جماعتیں پیدا ہو گئی ہیں، ایسے فرقے اسلام کے نام پر وجود میں آچکے ہیں جو لوگوں کو قرآن کی دعوت دے کر احادیث پاک کا سہارا لے کر، امت مسلمہ کو اسلاف کے نقش قدم اور صحابہؓ کرام کے عقیدے سے منحرف کرنے کی ناپاک کوششیں کر رہے ہیں اور ان کی بوالعجبی تو یہ ہے کہ وہ آیتیں جو بتوں کی پرستش سے ممانعت کے بارے میں نازل ہوئی تھیں اور جن میں کفار و مشرکین سے خطاب تھا اور بتوں کو پوجنے اور مصیبت کے وقت ان کو پکارنے کی وجہ سے ان کو مشرک و کافر کہا گیا تھا بڑی جرأت کے ساتھ ان گمراہ فرقوں نے انبیاے کرام اور اولیاے عظام پر چسپاں کر دیا اور ان سے توسل و استعانت کرنے والے مسلمانوں کو مشرکین کے زمرے میں لا کھڑا کیا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن فہمی کا دعوی کرنے والوں نے قرآن کو سمجھا ہی نہیں اور جوش تعصب میں بتوں کی پرستش اور ان سے استعانت کرنے والی آیات کو نبیوں اور ولیوں پر منطبق کیا۔ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں رسول اکرم ﷺ نے فرمایا تھا آخر زمانہ میں کچھ ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو قرآن پڑھیں گے اور قرآن ان کے حلق سے نہیں اترے گا۔

ملاحظہ کریں ابوداؤد کے حوالہ سے مشکوۃ جلد اول کتاب القضا، ص:۳۰۸، باب قتل اھل الردۃ میں انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: **سيكون في أمتي اختلافٌ و فرقةٌ قومٌ يُحْسِنون القِيْلَ و يُسِيئون الفِعْل، يقرؤن القرآن لايجاوز تراقيهم يمرُقُون من الدين مُرُوْق السهم من الرَّمِيَّةِ لا يرجعون حتى يرتدَّ السَّهمُ عَلى فُوْقِهٖ هم شرُ الخلق و الخليقة طوبٰى لمن قتلهم و قتلوه، يدعون إلى كتاب الله۔**

ترجمہ: عنقریب میری امت میں اختلاف و افتراق رونما ہوگا، ایک جماعت ایسی پیدا ہوگی جو قول کو پسند کرے گی اور فعل کو برا کہے گی۔ اس جماعت کے لوگ قرآن پڑھیں گے

مگر قرآن ان کے حلق سے نہ اترے گا اور یہ دین سے ایسے نکل جائیں گے جیسے تیر کمان سے، یہ دین کی طرف واپس نہ ہوں گے یہاں تک کہ تیر اپنے کمان میں واپس آجائے۔ یہ بدترین مخلوق اور بدتر خصلت والے لوگ ہوں گے۔ اللہ کی کتاب کی طرف بلائیں گے۔

نسائی کی روایت میں اس طرح ہے، ابوبرزہ اسلمی اس کے راوی ہیں حدیث کا آخر حصہ یہ ہے: يَخْرج فِي اٰخر الزَّمَانِ قَومٌ كَأَنَّ هٰذَا مِنْهُمْ يَقْرَؤُن الْقُرْاٰنَ لَا يُجَاوِزُ تَرَاقِيَهُمْ يَمْرُقُوْنَ مِنَ الْإِسْلَامِ كَمَا يَمْرُقُ السَّهْمُ مِنَ الرَّمِيَّةِ۔ (مشکوۃ، ج:۱، ص:۳۰۹)

اس زمانے میں غیر مقلدین وہابی، دیوبندی اور جماعت اسلامی وغیرہا کا یہی طریقہ کار ہے کہ یہ قرآن کے ترجمے، مفہوم اور معانی میں ایسی تبدیلی کرتے ہیں جس سے وہ اپنے اصلی معنی سے ہٹ جائے۔

ذیل کی سطور میں غیر اللہ سے مدد مانگنے اور ان کو پکارنے کا ثبوت قرآنی آیات کی روشنی میں ملاحظہ کریں۔

(۱) وَادْعُوْا شُهَدَاءَكُمْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۔ اور اللہ کے سوا اپنے سب حمایتیوں کو بلالو اگر تم سچے ہو (سورہ بقرہ، ۲۳) اس میں کفار کو دعوت دی گئی ہے کہ قرآن کی مثل کوئی سورت بنا کر لے آؤ اور اپنی مدد کے لیے حمایتیوں کو بلالو۔ غیر اللہ سے مدد مانگنے کی اجازت دی گئی ہے۔

(۲) یاایھاالذین اٰمنوا استعینوا بالصبر والصلوۃ اے ایمان والو! صبر اور نماز سے مدد چاہو۔ صبر اور نماز غیر اللہ ہیں۔ (پ:۲، سورہ بقرہ)

(۳) موسی علیہ السلام کو جب تبلیغ کے لیے فرعون کے پاس جانے کا حکم ہوا تو عرض کیا: وَ اجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ هٰرُوْنَ اَخِي اشْدُدْ بِهٖ اَزْرِيْ۔ اور میرے لیے میرے گھر والوں میں سے ایک وزیر کردے وہ کون میرا بھائی ہارون، اس سے میری کمر مضبوط کر۔ (طہ، ۳۱،۳۰،۲۹) یہاں رب نے یہ نہیں فرمایا کہ تم نے میرے سوا کا سہارا کیوں لیا۔ میں کافی

نہیں۔ بلکہ ان کی درخوست منظور فرمائی۔

(۴)حضرت ذوالقرنین نے آہنی دیوار بناتے وقت لوگوں سے مدد طلب کی تھی اَعِيۡنُوۡنِىۡ بِقُوَّةٍ۔ تم میری مدد طاقت سے کرو۔ (سورۂ کہف، ۹۵)

(۵)تَعَاوَنُوۡا عَلَى الۡبِرِّ وَ التَّقۡوٰى اور پرہیزگاری پر ایک دوسرے کی مدد کرو۔ (سورۂ مائدہ، ۲)اس کے علاوہ درجنوں آیات ایسی ہیں جن میں غیر اللہ سے مدد طلب کرنے کا ذکر ہے۔

صحیح احادیث سے بھی غیر اللہ سے مدد مانگنے کا ثبوت ملتا ہے۔

مشکوۃ، باب السجود وفضلہ میں ربیعہ بن کعب اسلمی سے بروایت مسلم یہ حدیث مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے مجھ سے فرمایا: سَلْ! فقلتُ أَسْئَلُکَ مُرَافَقَتَکَ فِي الجَنَّةَ۔ قال: أَوَ غَيْرَ ذٰلِکَ؟ قلت: هو ذٰک۔ قال: فأَعِنِّي على نَفْسِکَ بِكَثْرَةِ السُّجُوْدِ. اے ربیعہ! مانگ لو! میں نے کہا میں آپ سے جنت میں آپ کی رفاقت مانگتا ہوں، فرمایا کچھ اور مانگنا ہے میں نے کہا صرف یہی آپ نے فرمایا پھر اپنے نفس پر زیادہ نوافل سے میری مدد کرو۔ (مشکوۃ، باب السجود وفضلہ)

اب ہم ان آیتوں کو پیش کر رہے ہیں جن سے بدمذہب اور گمراہ فرقے اس بات پر استدلال کرتے ہیں کہ کسی نبی یا ولی یا مقرب بندے کو پکارنا ان سے مدد مانگنا شرک ہے اور اس فعل سے آدمی مشرک ہوجاتا ہے، ذیل میں ان کے استدلالات کا جائزہ لیں کہ وہ کہاں تک صحیح ہیں۔

آیت نمبر(۱) اِنَّ الَّذِيۡنَ تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمۡثَالُكُمۡ فَادۡعُوۡهُمۡ فَلۡيَسۡتَجِيۡبُوۡا لَكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ۔ بے شک وہ جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو تمھاری طرح بندے ہیں، تو انھیں پکارو پھر وہ تمھیں جواب دیں اگر تم سچے ہو۔ (سورہ اعراف، ۱۹۴) یہ اس آیت کا صحیح ترجمہ ہے۔

اور مخالفین نے اس آیت میں تدعون کا ترجمہ ''پکارتے ہیں'' کیا ہے۔ جو سراسر غلط اور

باطل ہے، پھر عباد امثالکم سے نبی اور ولی مراد لیا جو بداہتہً باطل ہے اور خود آیت قرآنی سے اس عقیدے کی تردید ہوتی ہے۔

دیکھیے! تفسیر کی معتبر کتاب، تفسیر خازن، علامہ علاؤ الدین خازن (م۷۲۵ھ) آٹھویں صدی ہجری کے عظیم مفسر اس آیت کریمہ کے تحت فرماتے ہیں:

''إن الذين تدعون من دون الله'' يعني الأَصْنَامَ التي يَعْبُدُهَا هٰؤُلَاءِ المُشركون إنما هي مملوكة لله أمثالهم۔ وقيل: إنها مسخرة مذللة مثل ما أنتم مسخرون مذللون۔ قال مقاتل: في قوله سبحانه و تعالى ''عباد امثالكم'' إنها الملئكة و الخطاب مع قوم يعبدون الملئكة و القول الأول أصح.

یعنی وہ بت جن کی یہ مشرکین پوجا کرتے ہیں وہ انھیں کی طرح اللہ کی مملوک ہیں، اور ایک قول یہ ہے کہ یہ اسی طرح تابع ہیں جس طرح تم ہو۔ اور مقاتل نے کہا عباد امثالکم سے فرشتے مراد ہیں اور یہ ایسی قوم سے خطاب ہے جو فرشتوں کی پرستش کرتی تھی، اور پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ (تفسیر خازن ج۲، ص۲۸۳، بیروت)

اتنا جاننے کے بعد بھی اگر تم ان بتوں کو پوجتے ہو تو انھیں پکارو، پھر وہ تمھیں جواب دیں، اگر تم سچے ہو فی کونھا الھۃ اس بارے میں کہ وہ معبود ہیں، یہ جملہ مشرکین سے بطور استہزا فرمایا گیا۔

اتنا فرمانے کے باوجود مشرکین نے ان کی عبادت کی اور ان کو معبود ٹھہرالیا اور اپنے کو بندہ، تو خدا نے ان معبودوں کے عجز کو یوں بیان فرمایا: اَلَهُمْ اَرْجُلٌ يَّمْشُوْنَ بِهَا اَمْ لَهُمْ اَيْدٌ يَّبْطِشُوْنَ بِهَا اَمْ لَهُمْ اَعْيُنٌ يُّبْصِرُوْنَ بِهَا اَمْ لَهُمْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا قُلِ ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ كِيْدُوْنِ فَلَا تُنْظِرُوْنِ ترجمہ: کیا ان کے پاؤں ہیں جن سے چلیں یا ان کے ہاتھ ہیں جن سے گرفت کریں، یا ان کی آنکھیں ہیں جن سے دیکھیں یا ان کے کان ہیں جن سے سنیں! تم فرماؤ اپنے شریکوں کو پکارو اور مجھ پر داؤں چلو اور مجھے

مہلت نہ دو۔(سورۂ اعراف،۱۹۵)

آیت نمبر(۲) قُلْ اَنَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَايَنْفَعُنَا وَ لَايَضُرُّنَا وَ نُرَدُّ عَلٰى اَعْقَابِنَا بَعْدَ اِذْ هَدَانَا اللّٰهُ۔ تم فرماؤ کیا ہم اللہ کے سوا اس کو پوجیں جو ہمارا نہ بھلا کرے نہ برا اور الٹے پاؤں پلٹا دیے جائیں، بعد اس کے کہ اللہ نے ہمیں راہ دکھائی۔(سورۂ انعام:۷۱،پ:۷)

مذکورہ بالا آیت کا دوسرا ترجمہ گمراہ گروں نے یہ کیا۔ آپ ان سے کہیے کیا ہم اللہ تعالی کے سوا ان کو پکاریں جو نہ ہمیں نفع دے سکتے ہیں اور نہ نقصان۔(حوالہ: کیا مسلمان کلمہ پڑھ کر بھی مشرک ہوسکتا ہے؟ص:۱)

اس آیت میں ترجمہ نگار نے ندعو کا ترجمہ پکارتے ہیں کیا ہے جو اہم کتب تفاسیر کی روایات کے خلاف ہے۔ یہاں دعا عبادت کے معنی میں ہے، اور یہ آیت بھی بتوں کی عبادت کے بارے میں وارد ہوئی ہے۔

امام فخرالدین رازی تفسیر کبیر میں اس آیت کے تحت لکھتے ہیں:''اِعْلَمْ أَنَّ الْمَقْصُوْدَ مِنْ هٰذِهِ الْاٰيَةِ الرَّدُّ عَلٰى عَبَدَةِ الْأَصْنَامِ''اس آیت سے مقصود بتوں کی پوجا کرنے والوں کا رد کرنا ہے۔ اس کے آگے لکھتے ہیں:''ندعوا من دون الله ما لاينفعنا'' أي نعبد من دون الله النافع الضار ما لا يقدر على نفعنا و لا على ضرنا۔ یعنی ہم اللہ کو چھوڑ کر جو بھلے برے کا مالک ہے اس کو پوجیں جو ہمیں نہ نفع دے سکیں اور نہ نقصان۔(تفسیر کبیر،ج:۷،ص:۲۵،دارالکتب العلمیۃ بیروت،آیت:۷۱،سن:۲۰۰۰ء)

امام علاؤالدین خازن اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

قل یا محمد! لهؤلاء المشركين الذين دعوك إلى دين آبائك أ ندعوا يعني أ نعبد من دون الله يعني الأصنام التي لاتنفع من عبدها و لا تضر من ترك عبادتها۔ اے نبی ﷺ آپ ان مشرکین سے کہہ دیں جنھوں نے آپ کو آپ کے آبا کے دین کی طرف بلایا کیا ہم اللہ کے سوا ان بتوں کی پرستش کریں جو اپنے

پرستار کو نفع نہ دے اور عبادت نہ کرنے والے کو ضرر نہ دے۔ (تفسیر خازن، ج:۲، ص:۱۲۴، سورہ انعام:۷۱، بیروت ۱۹۹۵)

ان تفاسیر کی روشنی میں یہ واضح ہوگیا کہ یہ آیتیں بتوں کی عبادت کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سی آیات ہیں جو معبودان باطلہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ مزید تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔

اس کے علاوہ جن آیتوں میں غیر خدا کو پکارنے سے روکا گیا ہے اگر ان کو مطلق رکھا جائے تو مطلب یہ ہوگا: حاضر، غائب، زندہ، مردہ، نبی اور ولی کسی کو نہ پکارو جب کہ یہ معنی خود دوسری قرآنی آیات کے خلاف ہے، اور عقل میں بھی یہ بات نہیں آنے والی ہے کہ انسان کو ہمیشہ ایک دوسرے سے باہمی تعاون کی ضرورت ہوتی ہے اور مدد لینی پڑتی ہے۔ دین و دنیا کا قوام اسی پر منحصر ہے۔ پھر ایسے ضروری امر کو رب کیسے شرک فرما سکتا ہے۔

رب کا ارشاد ہے: **ادعوھم لاٰبائھم** انھیں ان کے باپ ہی کا کہہ کر پکارو۔ (کنز الایمان، احزاب، ۵) اس آیت میں خدائے تعالیٰ خود اپنے بندوں کو پکارنے کا حکم دے رہا ہے۔

دوسری آیت میں ارشاد ہے: **و الرسول یدعوکم فی اخرٰکم** اور دوسری جماعت میں ہمارے رسول تمھیں پکار رہے تھے۔ (سورہ اٰل عمران، ۱۵۳) اس آیت میں غزوہ احد کا ذکر ہے جس میں رسول ﷺ نے مسلمانوں کو پکارا تھا۔

ثم ادعھن یاتینک سعیا۔ پھر انھیں بلاؤ وہ تیرے پاس چلے آئیں گے پاؤں سے دوڑتے۔ (سورۂ بقرہ، ۲۶۰) اس آیت میں ابراہیم علیہ السلام کے جانوروں اور پرندوں کے ٹکڑوں کو پکارنے کا ذکر ہے۔

نیز نمازوں میں ہم ہمیشہ حضور ﷺ کو پکار کر سلام عرض کرتے ہیں۔ **السلام علیک ایھا النبي و رحمة الله و بركاته** اے نبی آپ پر سلامتی، اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں ہوں۔

پس مطلقاً غیر خدا کو پکارنے سے اگر کوئی مشرک ہوجائے تو پھر روے زمین پر کوئی شخص مسلمان باقی رہے گا۔ العیاذ باللہ اور یہ باطل ہے۔

لہٰذا ضرورت پیش آئی کہ ہم قرآن ہی سے پوچھیں کہ ممانعت والی آیات میں پکارنے سے کیا مراد ہے تو قرآن پاک نے ان آیتوں کی تفسیر یوں فرمائی: وَ مَنْ یَّدْعُ مَعَ اللّٰہِ اِلٰـھًا اٰخَرَ لَا بُرْھَانَ لَہٗ بِہٖ۔ وَ لَا تَدْعُ مَعَ اللّٰہِ اَحَدًا اور جو اللہ کے ساتھ کسی دوسرے خدا کو پوجے جس کی اس کے پاس کوئی سند نہیں تو اس کا حساب اس کے رب کے یہاں ہے (مؤمنون: ۱۱۷) اور اللہ کے ساتھ کسی کو نہ پوجو۔ ان آیتوں میں کہا گیا ہے اسے خدا سمجھ کر نہ پکارو یا اللہ کے ساتھ ملا کر نہ پکارو۔

اسی طرح قرآن نے کہا جو غیر خدا کو ولی اور مددگار ٹھہرائے وہ کافر و مشرک ہے۔

(۱) ارشاد ہے مَا لَکُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّ لَا نَصِیْرٍ۔ تمھارا خدا کے سوا نہ کوئی ولی ہے نہ مددگار۔

(۲) اَفَحَسِبَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا اَنْ یَّتَّخِذُوْا عِبَادِیْ مِنْ دُوْنِیْ اَوْلِیَآءَ اِنَّآ اَعْتَدْنَا جَھَنَّمَ لِلْکٰفِرِیْنَ نُزُلًا۔ تو کیا کافر یہ سمجھتے ہیں کہ میرے بندوں کو میرے سوا حمایتی بنائیں گے بے شک ہم نے کافروں کی مہمانی کو جہنم تیار کر رکھی ہے۔ (سورہ کہف، ۱۰۲)

اس قسم کی بے شمار آیتیں ہیں جن میں غیر خدا کو جس نے ولی بنایا اسے کافر کہا گیا ہے۔ اگر ان آیات کو اسی طرح مطلق رکھا جائے اور غیر خدا کے ولی بنانے والوں کو مشرک کہا جائے تو خود کلام باری تعالیٰ میں استحالہ لازم آئے گا۔ لہٰذا پتہ چلا کہ آیتوں میں مطلق ولی مراد نہیں ہے بلکہ یہ مقید ہے، اس لیے کہ خود قرآن پاک میں کہا گیا فَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْکَ وَلِیًّا وَّ اجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْکَ نَصِیْرًا۔ اور ہمیں اپنے پاس سے کوئی حمایتی دے اور ہمیں اپنے پاس سے کوئی مددگار (نسا، ۷۵) یہ دعا کرنے والے مسلمان ہیں اور اس پر انھیں کچھ نہیں کہا گیا۔

قرآن پاک کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے: کسی کو ولی ماننا چار طرح کا ہوتا ہے، تین

قسموں کا ولی ماننا تو شرک وکفر ہے، اور چوتھی قسم کا عین ایمان ہے۔

پہلی قسم کی مثال: رب تعالی کو کمزور جان کر کسی کو مددگار بنانا یہ شرک ہے، رب کا ارشاد ہے وَ لَمْ یَکُنْ لَّهٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَ كَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا۔ اور کمزوری میں کوئی اس کا حمایتی نہیں اور اس کی بڑائی بولنے کو تکبیر کہو۔ (پ:۱۵، سورۂ بنی اسرائیل، ۱۱۱)

(۲) خدا کے مقابل کسی کو مددگار جاننا یعنی رب تعالی عذاب دینا چاہے اور ولی بچالے۔ اُولٰٓئِكَ لَمْ يَكُوْنُوْا مُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ وَ مَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ۔ وہ تھکانے والے نہیں زمین میں اور نہ اللہ سے جدا ان کے کوئی حمایتی۔ (ہود، ۲۰)

دوسری آیت: و ما کان لهم من اولیاء ینصرونهم من دون الله۔ اور ان کے کوئی دوست نہ ہوئے کہ اللہ کے مقابل ان کی مدد کرتے۔ (سورۂ شوری، آیت: ۴۶)

(۳) تیسری قسم یہ ہے: کسی کو مددگار سمجھ کر اس کو پوجنا یعنی ولی بمعنی معبود۔ والذین تخذوا من دونه اولیاء ما نعبدهم الا لیقربونا الی الله زلفا اور وہ جنھوں نے رب کے سوا ولی بنائے (یہ کہتے ہوئے) کہ ہم انھیں نہیں پوجتے مگر اس لیے کہ وہ ہمیں اللہ سے قریب کردیں۔

ہندوازم کے بنیادی نظریات

محمد رضا قادری مصباحی
متعلم: درجۂ فضیلت (۲۰۰۷ء)
الجامعۃالاشرفیہ، مبارک پور

قبل اس کے کہ ہندوازم (Hinduism) یعنی ہندتو کے اصولی عقائد سے بحث کی جائے، ہندوازم کے معنی اور مفہوم سے واقفیت ضروری ہے ساتھ ہی یہ بھی کہ اس کا دائرۂ اطلاق کیا ہے۔

''ہندو'' کلمۂ ہند سے مشتق ہے جو قدیم ہے اس لفظ کا استعمال پہلے عربوں اور ایرانیوں نے کیا اور وہ بھی محض جغرافیائی حیثیت سے، ابتداءً اہل ہند اس سے ناواقف تھے۔ احادیث نبویہ سے بھی اس کا ثبوت ہوتا ہے۔ چنانچہ سنن نسائی، باب غزوۃ الہند اور معجم طبرانی میں حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: قال رسول الله صلى الله عليه و سلم: عصابتان من أمتي أحرزهما الله من النار، عصابة تغزوالهندوعصابة تكون مع عيسى بن مريم عليهما السلام دوسری حدیث حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ آپ فرماتے ہیں: وعدنا رسول الله صلى الله عليه و سلم غزوة الهند، فإن أدركتها أنفق فيها نفسي، فإن أقتل كنت أفضل الشهداء، وإن أرجع فأنا ابوهريرة المحرر۔ رواہ النسائی و احمد۔

ان کے علاوہ تاریخ طبری ج:۳، سیرت ابن ہشام ج:۲ اور طبقات ابن سعد ج:۱ وغیرہا میں بھی اس کی تفصیل مذکور ہے۔ احادیث پاک میں مذکور لفظ ''ہند'' سے ایک خاص ملک مراد ہے جس کا نام اب ہندوستان، فارسی اور اردو زبان میں ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ اس سرزمین کو حضرت نوح علیہ السلام کے پوتوں میں سے حضرت ہند ابن توقیر ابن یقطن ابن عامر ابن شالخ ابن ارفخشد ابن سام ابن نوح علیہ السلام نے طوفان نوح کے بعد آباد فرمایا اسی مناسبت سے اس پورے خطے کا نام ہند پڑ گیا۔ آپ موحد اور اللہ والے تھے

امام ابوجعفر محمد بن جریر طبری، تاریخ الامم والملوک میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل فرماتے ہیں: قال ابن عباس: و العرب و الفرس و النبط و الهند و السند من ولد سام بن نوح۔[1] دسویں صدی عیسوی تک کلمہ ''ہندو'' سے ہند کا باشندہ، ہندی تہذیب وروایات کا خوگر سمجھا جاتا رہا۔ بعد میں چل کر اس کلمہ سے ہندو مذہب کا ماننے والا یا ایک مخصوص دھرم کا متبع مفہوم ہوا، یہاں تک کہ اب یہ اصطلاح ایک خاص طبقہ کے لوگوں میں محدود ہوگئی۔ چنانچہ ایشیا کے مشہور سیاح اور عظیم مؤرخ، ابوریحان البیرونی (متوفی ۱۰۴۸ء) کی کتاب در تحقیق ما للهند من مقولة في العقل، میں بھی معنی ثانی کا کہیں کوئی ذکر نہیں ہے۔

ہندوازم کی تعریف: اس کی جامع اور صحیح تعریف اس کے بنیادی افکار جاننے کے بعد ہی ممکن ہے تاہم راقم سطور اس کے مطالعہ کے بعد جس نتیجے پر پہنچا ہے، اس کی رو سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہندو مذہب کافی حد تک ان سماجی رسم و رواج اور رہبانی افکار کا مجموعہ ہے جو ہزاروں سال تک پروان چڑھتا ہوا ایک مذہب کی شکل اختیار کر گیا۔ نہ یہ مذہب، الہامی ہے نہ ہی اس میں رب العالمین کا کوئی جامع اور مانع تصور پایا جاتا ہے۔

آمدم بر سر مطلب: اس اجمال اور مختصر تمہید کے بعد ان کے چند بنیادی عقائد کی تشریح اختصار کے ساتھ ہم قارئین کی نذر کر رہے ہیں، چوں کہ اس مختصر سے مقالے میں تمام نظریات کا استیعاب ممکن نہیں، ساتھ ہی اپنی کم مائیگی اور قلت مطالعہ بھی دامن گیر ہے اس لیے چند موٹی موٹی باتوں پر اکتفا کرتا ہوں۔ ہندوازم کے نظریات کی اجمالی فہرست ہم ذیل میں درج کررہے ہیں جن میں سے بعض پر ہمیں کچھ خامہ فرسائی کرنی ہے۔

ا۔ ہندوازم میں تصور الہ۔ (عقیدۂ وحدت الوجود)

(۱) تاریخ الأمم والملوک، ج:۱، ص:۱۹۵۔ مطبوعہ: دارالفکر بیروت، ذکر الأحداث التي كانت في عهد نوح علیہ السلام۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کے بارے میں تجسم، تحلیل اور احتیاج کا نظریہ۔
۳۔ خدا، روح، مادہ اور کائنات چاروں قدیم ہیں۔
۴۔ تخلیق کائنات کے بارے میں ہندوازم کا نظریہ۔
۵۔ کائنات لاابتدا اور لاانتہا ہے۔
۶۔ تناسخ اور آواگون، وید شاستر سے اس کے دلائل۔
۷۔ سوامی دیانند جی کے نظریہ آواگون کا تجزیہ۔
۸۔ جزائے اعمال، آواگون اور آخرت تینوں کی تشریح۔
۹۔ پنڈت لیکھ رام داس کے دلائل، آواگون کے ثبوت میں اور ان کا تجزیہ۔

ہندوازم میں عقیدۂ وحدت الوجود کی حقیقت: ہندو مذہب میں چار کتابوں کو اساسی حیثیت حاصل ہے اور ان کو سارے ہندو، مصادر و ماخذ احکام مانتے ہیں۔ وہ یہ ہیں: ۱۔ رگ وید ۲۔ یجروید ۳۔ سام وید ۴۔ اتھروید۔ ان میں اول الذکر دو ویدوں کے حوالے سے الہ کا تصور ملاحظہ کریں۔ اردو زبان میں اس کا خلاصہ یہ ہے

رگ وید میں ہے: ''اے انسان! سورج وغیرہ نورانی مخلوقات کا سہارا اور پیدا شدہ اور پیدا ہونے والے جہان کا ایک لاثانی مالک پرماتما ہی اس عالم کی پیدائش سے پہلے موجود تھا اور جس نے زمین سے لے کر سورج تک ساری کائنات کو پیدا کیا اس پرماتما کی پرستش کیا کر''[(۱)]

یجروید میں ہے: اے انسان! جو سب میں کامل وجود، لافانی، سبب اول، جیو کا مالک زمین وغیرہ بے جان اشیا اور جیو سے الگ ہے وہی پرش اس سب گزشتہ اور آئندہ عالم کو بنانے والا ہے''۔[(۲)]

رگ وید میں دوسرے مقام پر اس طرح ہے: ''اے انسان! جس سے مختلف قسم کی

(۱) آواگون، بحوالہ رگ وید، (ص ۱۶)
(۲) یجروید اردو ستیارتھ پرکاش باب ۵ ص ۲۷۰، ۲۷۱

موجودات ظاہر ہوئیں جو اس کو سہارا دیتا اور فنا کرتا ہے جو اس دنیا کا مالک ہے اور جس محیط کامل میں یہ سارا جہان پیدا ہوکر اور قدیم ہوکر فنا ہوجاتا ہے وہ پرماتما ہے تو اس کو جان اور دوسرے کو خالق مت مان"۔

مذکورہ بالا اقتباسات سے چند باتیں معلوم ہوئیں: ۱۔ پرماتما (خدا) وہی بے ہمتا اور بےنظیر ذات ہے جس نے کائنات کے ذرہ ذرہ کو پیدا فرمایا۔ چاند، سورج اور ستارے زمین و آسمان سب کی تخلیق اسی خالق جزو کل نے فرمائی۔ ۲۔ جب وہی پروردگار سب سے پہلے سے موجود ہے تو وہی واجب الوجود بھی ہے وہی خالق ہے اس کے سوا کوئی دوسرا خالق نہیں۔ رگ وید کے اس اقتباس سے عقیدۂ توحید کا ثبوت ہوتا ہے۔ یہاں تک تو توحید الٰہی کا عقیدہ صحیح ہے، بات صرف رگ وید پر ختم نہیں ہوجاتی بلکہ بعد میں اس مذہب کے بادہ خواروں نے شرک کی آمیزش کرکے عقیدہ توحید کو پارہ پارہ کردیا اور لاتعداد چیزوں کو خدا کا سہیم و شریک قرار دیا، اگرچہ بعض جگہوں پر غیر شعوری ہے لیکن اس سے توحید کا قصر عظیم زمین بوس ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔

اللہ تعالی کے بارے میں تجسیم، تحلیل اور احتیاج کا نظریہ: دوسرا بنیادی نظریہ، یہ ہے کہ خدا اگرچہ ایک ہی ہے لیکن وہ مختلف شکلوں میں متشکل اور متعدّد صورتوں میں متصور ہوتا رہتا ہے، جس شکل میں تبدیل ہونا چاہے اپنی مرضی سے ہوجاتا ہے ان سب کے باوجود وہ ایک ہی ہے۔ اس کی تائید میں ہم انھیں کی کتاب سے ایک اقتباس پیش کرتے ہیں، سوامی رام سکھ داس اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

एक परमात्मा ही अनेकरूप बन जाते हैं और फिर अनेकरूप त्याग करके एक रुप हो जाते हैं। अनेक रूप से होने पर भी वे एक ही रहते हैं।[1]

اس عبارت سے یہ معلوم ہوا کہ خدا مختلف شکلوں میں ظہور فرماتا ہے اور شکل کے لیے مجسم ہونا ضروری ہے اس لیے اس اعتبار سے ہندؤوں کا خدا وہ ہے جو جسم والا ہے۔

اسلامی فرقوں میں سے ایک فرقہ جو ضلالت کی راہ پر چلا معتزلہ ہے اس کا بانی واصل بن عطا ہے، اس فرقے کا ایک عقیدہ یہ بھی ہے کہ خدائے تعالی فاعل مضطر ہے یعنی جب کوئی بندہ

اعمال صالحہ کرے تو خدا پر اس کو جزائے خیر دینا واجب ہے اسی طرح افعال سیئہ پر جزائے شر دینا اس پر واجب ہے۔ بعینہ یہی فکر ہندو مذہب کی بھی ہے تعبیر میں صرف جزوی فرق ہے وہ کہتا ہے کوئی بھگت (بندہ) اپنے خالق سے جب بے پناہ محبت کرنے لگتا ہے تو خدا کو آنا ہی پڑتا ہے۔ اور جس طرح بندے کو خدا کے بغیر چین اور قرار نہیں ملتا اسی طرح خدا کو بھی بندہ کے بغیر چین اور سکون نہیں ملتا، بلکہ یہاں تک کہہ دیا کہ جب بندہ اس کے لیے روتا ہے تو پرمیشور کو بھی اس کے لیے رونا پڑتا ہے ملاحظہ کریں اصل عبارت۔ سوامی رام سکھ داس لکھتے ہیں:

अगर उनकी प्रप्तकी जोरदार इच्छा हो जाये तो भगवान को आना ही पड़ेगा, जो भक्त परकार मेरी शरण लेते हैं मैं उन्हें उसी परकार आश्रय देता हूं। हमें भगवान के बिना चैन नहीं पड़ेगा तो भगवान को भी हमारे बिना चैन नहीं पड़ेगा। हम भगवान के बिना रोते हैं तो भगवनान भी हमारे बिना रोने लग जायेगा।[1]

یہ گیتا میں مذکور ایک منتر کی تشریح وتفسیر ہے جس کا مفہوم بھی تقریباً واضح ہے۔ گیتا کی عبارت یہ ہے گیتا میں بھگوان نے کہا ہے:

ये यथा मां प्रपद्यन्ते तास्त थैव भजाम्यहम (4111)

خدا، روح، مادہ اور کائنات، قدیم اور ازلی ہیں: قارئین کو یہ بات بڑی تعجب خیز معلوم ہوگی کہ ہندوؤں کی مذہبی کتاب ایک طرف تو یہ کہتی ہے کہ اس سروشٹی (کائنات) سے پہلے صرف وہ لاثانی پرماتما ہی موجود تھا اور اسی نے تمام چیزوں کی تخلیق فرمائی اب بالکل اس کے برعکس دوسرے عقیدے کا وہ اظہار کرتے ہیں۔

ہندو آریہ سماج کے بہت بڑے پنڈت، سوامی دیانند سرسوتی، سوال و جواب کے پیرائے میں اس پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

سوال: یہ عالم پرمیشور سے پیدا ہوا ہے یا کسی اور سے؟

جواب: علتِ فاعلی پرماتما سے پیدا ہوا ہے۔ لیکن اس کی علت مادی، مادہ ہے۔

سوال: کیا مادہ کو ایشور نے پیدا نہیں کیا؟

جواب: ایشور جیو (روح) اور مادہ یہ تینوں چیزیں ازلی ہیں۔ [(۱)]

ایک جگہ لکھتے ہیں:

سوال: کتنی چیزیں ازلی ہیں؟

جواب: ایشور، جیو اور عالم کی علت مادہ، تینوں ازلی ہیں۔ [(۲)]

کائنات کی ازلیت ثابت کرنے سے قبل ویدوں کے حوالے سے اس کی تخلیق کا ذکر مناسب ہوگا۔ وید کہتا ہے یہ ساری کائنات پیدائش سے پہلے تاریکی سے گھری ہوئی تھی۔ رات کے مانند نہ جاننے کے قابل، آکاش روپ اور تُچھ (خلا کی صورت اور بے حقیقت) یعنی لاانتہا، پرمیشور کے سامنے جزوی طور پر ڈھکا ہوا تھا، بعد ازاں پرمیشور نے اس کو اپنی طاقت سے علت کی صورت سے نکال کر معلول کی صورت میں تبدیل کر دیا۔ [(۳)]

کائنات لاابتدا اور لاانتہا ہے: ہندوازم کا ایک بنیادی نظریہ یہ بھی ہے کہ کائنات کا نہ کوئی آغاز ہے اور نہ کوئی انتہا، یہ الگ بات ہے کہ خود وید ہی سے اس عقیدہ کی تردید ہو جاتی ہے ابھی ماقبل میں گزرا، اے انسان! ایک لاثانی پرماتما ہی اس کائنات کی پیدائش سے پہلے موجود تھا پھر اس نے نیست سے ہست کی منزل میں کیا۔

سوامی دیانند جی، سوال و جواب کے انداز میں لکھتے ہیں:

سوال: کہیں سرشٹی (کائنات) کا آغاز بھی ہے؟

جواب: نہیں، جس طرح دن سے پہلے رات اور رات سے پہلے دن اور دن کے بعد رات اور رات کے بعد دن برابر چلا آتا ہے اسی طرح پیدائش کے بعد قیامت اور قیامت کے

(۱) توحیطو: پچھلے صفحہ کا، ص ۴۳۸ موجودہ ص ۵۸

(۲) اردو ستیارتھ پرکاش، ص: ۲۷

(۳) بحوالہ رگ وید ستیارتھ پرکاش

(۴) آواگون کا تحقیقی جائزہ، ص: ۱۵

بعد پیدائش ہے، ازل سے یہی چکر چل رہا ہے، اس کا آغاز یا انجام نہیں، لیکن جس طرح دن اور رات کا انجام اور آغاز دیکھنے میں آتا ہے اسی طرح پیدائش اور پرلے (فنا) کا آغاز و انجام ہوتا رہتا ہے؛ کیوں کہ تینوں، پرماتما، روح اور جہاں کی علت مادی اپنی ذات سے ازلی ہیں۔ اسی طرح عالم کی پیدائش، قیام اور موجودگی کے تسلسل کی وجہ سے لاابتدا ہیں جس طرح پرمیشور کی صفات، افعال کا آغاز یا انجام نہیں، اسی طرح اس کے کاموں کا بھی آغاز و انجام نہیں۔ (۱)

مندرجہ بالا اقتباسات سے چند بنیادی عقائد کا پتہ چلتا ہے اول یہ کہ "زمانہ" قدیم ہے حادث نہیں۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ زمانہ غیر قار مقدار حرکت کا نام ہے اور اس کے لیے دن یا رات کا کوئی حصہ لازم اور روز و شب کا حال یہ ہے کہ ان کا آغاز ہے نہ ہی انجام تو جب قدامت لازم کو مستلزم ہوئی تو یہی ملزوم کو بھی مستلزم ہوگی؛ اس لیے کہ یہ قاعدہ مسلم ہے کہ جو چیز لازم کو مستلزم ہو وہ ملزوم کو بھی مستلزم ہوتی ہے، اور جب خدا بھی قدیم اور زمانہ بھی تو زمانہ خدا کا شریک ہوا۔ یہی وہ باریک نکتہ ہے جس کو ہنود نہ سمجھ سکے اور خدا کو ایک مانتے ہوئے بھی شرک کی بلا میں گرفتار ہو گئے۔

تیسری دلیل: سوامی دیانند نے اپنی کتاب میں یہ بھی لکھ دیا کہ جس طرح صفات باری تعالی ازلی ہیں ان کے لیے کوئی آغاز ہے اور نہ کوئی انتہا اسی طرح اس کے افعال بھی ازلی ہیں۔ اور خدا کے افعال یہ بھی ہیں کہ اس نے اس عالم رنگ و بو کو عدم سے وجود بخشا جو کہ بداہتہً حادث اور غیر ازلی ہے۔ اب سوامی جی کے قول کی بنیاد پر عالم قدیم، ازلی ٹھہرا تو مافی العالم کو کیا کہیں گے، ان کو بھی ازلی اور قدیم ہی ماننا پڑے گا؛ اس لیے کہ یہ بھی افعال میں داخل، تو اب اس تقدیر پر کائنات کی کوئی ایسی شئ باقی نہ رہی جو قدیم نہ ہو نعوذ باللہ من ذٰلک۔ **تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَ تَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَ تَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا** ۔ قریب ہے کہ

(۳) سوامی دیانند سرسوتی، ستیارتھ پرکاش اردو باب: ۸، ص: ۲۹۱

آسمان پھٹ پڑیں، زمین شق ہوجائے اور پہاڑ ڈھ جائیں۔ حیف صد حیف! ایسے عقیدہ پر جو سراپا شرک عظیم کا مجسمہ ہے۔

سوامی دیانند کے دلائل پر معارضہ: سوامی جی! جب وید شاستر سے یہ ثابت ہوگیا کہ یہ سرشٹی (کائنات) اور سنسار از خود بنی ہوئی نہیں ہے بلکہ اس کو بنانے والا ایک لاثانی پرماتما ہے تو پھر یہ لاابتدا کیسے ہوئی؟ لاابتدا، تو وہ ہوتا ہے جس کو کسی وستو نے بنایا نہ ہو، سوامی نے روح اور مادہ کو بھی ازلی کہا ہے جب کہ رگ وید کے ستروں میں لاثانی، مالک کہا گیا ہے، اگر روح اور مادہ دونوں ازلی فرض کیے جائیں تو یہ دونوں صفت ازلیت میں خدا کے شریک اور جب یہی روح اور مادہ دیگر مخلوقات میں ہیں تو یہ روح اور مادہ بھی ازلی تو اب ہر ذی روح اور صاحب مادہ شئ کو بھی ازلی اور قدیم ماننا ہی پڑے گا تو پرماتما لاشریک کہاں رہا؟

آخری بات: سوامی دیانند جی نے رات اور دن کی مثال سے کائنات کا لاابتدا اور لاانتہا ہونا ثابت کیا ہے، نیز یہ بھی کہا کہ جس طرح دن کے بعد رات اور رات کے بعد دن چلا آرہا ہے ان کا کوئی آغاز وانتہا نہیں اس لیے یہ بھی لاابتدا اور لاانتہا ہیں۔ میں ان سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ دن اور رات کا وجود سورج کی گردش سے ہوتا ہے اور جب سورج ہی نہ تھا تو دن اور رات کا وجود کیسا؟ جب سورج بنا تو رات بھی بنی اور دن بھی بنا تو اس کی ابتدا بھی ہوئی اور ایک کے جانے کے بعد دوسرے کا وجود ہوتا ہے اس اعتبار سے انتہا بھی ہوئی۔ اس باب میں اور بھی کلام کی گنجائش ہے لیکن ہم اسی قدر پر اکتفا کرتے ہیں یہ خیال کرتے ہوئے ”مطیۃ الکذب کاذب“، جس دھرم کی پوری بنیاد ہی جھوٹی اور وہمی نیو پر ڈالی گئی ہو اس پر تعمیر ہونے والا محل بھی تار عنکبوت سے زیادہ ٹھوس نہ ہوگا کہ باد مخالف کا ایک جھونکا ہی اس کے لیے کافی ہے۔

تناسخ اور آواگون کا نظریہ: تناسخ کا معنی ہے ”روح کا ایک قالب سے دوسرے قالب میں منتقل ہوجانا“[1] المعجم الوسیط (عربی) میں ہے: تناسخ الأرواح ،انتقلت من

(۱) فیروز اللغات خرد، ص:۲۱۵

أجسام إلى أخرى كما يزعم بعضهم (مو)۔ تناسخ الروح: عقيدة شاع أمرها بين الهنود و غيرهم من الأمم القديمة، مؤداها أنّ روح الميت تنتقل إلى حيوان أعلى أو أقلّ منزلة لتنعم أو تعذب جزاء على سلوك صاحبها الذي مات و أصحاب هذه العقيدة لايقولون بالبعث[1] ترجمہ: تناسخ روح کا عقیدہ، ہنود وغیرہ گزشتہ قوموں میں شائع و ذائع ہے جس کی بنیاد اس پر ہے کی میت کی روح دوسرے جاندار کی طرف منتقل ہوتی رہتی ہے خواہ وہ جاندار رتبے میں اس سے اعلی ہو یا ادنی اور یہ اس لیے منتقل ہوتی ہے کہ مرنے والے کو اس کے عمل کے مطابق راحت یا عذاب کی صورت میں بدلہ دیا جاتا ہے۔ اس عقیدہ کے حاملین مرنے کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے کو نہیں مانتے، یعنی بعث بعد الموت کے قائل نہیں۔

بلفظ دیگر یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ تناسخ ایک ہی روح کے ساتھ بار بار پیدا ہونے اور مرجانے کا نام ہے۔

''آواگون'' ہندو دھرم کا بنیادی اور مختلف الجہات عقیدہ ہے، اس عقیدہ کی رو سے انسان جب مرجاتا ہے تو اس کی روح دوسرے جسم میں منتقل ہوکر ظہور کرتی ہے، روح کے انتقال کا یہ سلسلہ اس وقت تک منقطع نہیں ہوتا جب تک اسے مکتی (نجات) نہ مل جائے۔ اگر بندہ نے پہلے جنم میں اچھے اعمال کیے ہیں تو اسے اعلی قسم کے جاندار میں منتقل کیا جاتا ہے، مثلا: عالموں اور دیوتاؤں کے اجسام میں اور برے اعمال کیے ہیں تو گھٹیا اور برے اجسام، مثلا: کتا، بلی، سانپ، پیڑ، پودے وغیرہا میں منتقل کیا جاتا ہے۔ پھر اگر اچھا کام کرے تو اس سے اونچے درجہ کا جسم ملتا ہے حتیٰ کہ تناسخ کا یہ سلسلہ ۸۴ر لاکھ جسموں تک چلتا رہتا ہے تب کہیں جاکر اسے نجات حاصل ہوتی ہے، گویا زندگیاں اس کے سابقہ اعمال ہی کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ یہ خلاصہ ہے اس نظریے کا اب، ذیل کی سطور میں آواگون کے دلائل ملاحظہ کریں:

---

(۱) المعجم الوسیط، ص: ۹۱۷

آواگون کے دلائل: پنڈت سوامی دیانند لکھتے ہیں:

سوال: انسان کا جیو، حیوانات وغیرہ اور حیوانات وغیرہ کا انسان کے جسم میں، عورت کا مرد کے اور مرد کا عورت کے جسم میں جاتا ہے یا نہیں؟

جواب: ہاں! جاتا ہے کیوں کہ جب بدی بڑھ جاتی ہے اور نیکی کم ہوجاتی ہے تب انسان کا جیو، ادنی حیوانات وغیرہ اجسام میں جاتا ہے اور جب نیکی بڑھ جاتی ہے اور بدی کم ہوجاتی ہے تب دیوتا، یعنی عالم کا جسم ملتا ہے اور جب نیکی اور بدی برابر ہوتی ہے تو عام آدمیوں کا جسم ملتا ہے۔[1]

دوسری دلیل: ہندوازم میں اگر آواگون کو نہ مانا جائے تو پرمیشور پر بے انصافی کا الزام عائد ہوتا ہے کہ اس نے کسی جیو کو امیر اور کسی کو غریب بنایا، کسی کو عقل و حکمت سے نوازا اور کسی کو محروم رکھا، کوئی سکھ میں ہے تو کوئی دکھ میں، ایسا کیوں؟ کیا یہ سب ایک خدا اور ایک پرماتما کے بندے نہیں ہیں؟ آواگون نے ان سارے اعتراضات کا جواب دے دیا کہ انسان اگر اس جنم میں غریب پیدا ہوا ہے یا دکھ میں ہے تو گھبرانے کی ضرورت نہیں دوسرے جنموں میں وہ امیر اور سکھی ہوگا۔ سوامی دیانند لکھتے ہیں:

سوال: جب جیو کو پچھلے جنم کے حال کا علم نہیں اور ایشور اس کو سزا دیتا ہے تو جیو کا سدھار نہیں ہوسکتا کیوں کہ جب اس کو معلوم ہو کہ فلاں نے جو کام کیا تھا، اسی کا نتیجہ یہ ہے تب ہی وہ پاپ کے کاموں سے بچ سکے گا۔

جواب: حکومت و دولت، عقل، علم، غریبی، بے عقلی، جہالت اور دکھ سکھ دیکھ کر پچھلے جنم کی باتیں کیوں نہیں جان لیتے؟ حکمت سے ناواقف بھی بخار وغیرہ بیماریوں کے ہونے سے اتنا جان سکتا ہے کہ مجھ سے کوئی بدپرہیزی ہوگئی ہے۔ اگر پچھلے جنم کو نہ مانو گے تو پرمیشور

---

(۱) آواگون ص ۱۰ بحوالہ اردو ستیارتھ پرکاش ص: ۳۲

طرفداری کرنے والا ٹھہر جاتا ہے۔ [۱]

پنڈت لیکھ رام داس کے دلائل: پہلے یہ بتادوں کہ پنڈت موصوف انیسویں صدی عیسوی کے آخری دور کے مصنف ہیں، انھوں نے براہ راست سوامی دیانند کے ذریعے آریہ سماج دھرم قبول کیا تھا۔ فارسی بھی اچھی خاصی جانتے تھے وہ آواگون کے اثبات میں رام چندر جی کا ایک قول پیش کرتے ہیں:

رامائن آریہ کانڈ سرگ ۶۳ ر شلوک ۵۴، ۵۵ میں رام چندر جی فرماتے ہیں: ''لچھمن! پچھلے جنم میں یقیناً مجھ سے بار بار پاپ ہوئے جن کی وجہ سے مصیبت میں گرفتار ہوا، حکومت سے باہر ہوا، عزیزوں، دوستوں سے جدا ہوا، باپ کا انتقال ہوا، ماں سے جدائی ہوئی، اے لچھمن! یہ سب مصائب ہم کو پچھلے جنم کے پاپوں کے نتیجے میں بھگتنے پڑے''۔ [۲]

تیسری دلیل: پنڈت لیکھ رام کہتے ہیں کہ تناسخ سے منکر مذہب والے مانتے ہیں کہ اس جنم کے کرموں کے مطابق ہی بہشت و دوزخ مل جائیں گے مگر یہ بھاری غلطی ہے کیوں کہ پرمیشور نیائے کاری ہے، محدود فعلوں کے لیے ہمیشہ کا دوزخ و بہشت دینا اس کے عدل و انصاف کے خلاف ہے، کیوں کہ انصاف یہ کہتا ہے کہ محدود کرموں کا پھل محدود ہونا چاہیے، پس جب تک پنر جنم نہ مانا جائے خدا کے ذمہ سے الزام دور نہیں ہوسکتا۔ [۳]

چوتھی دلیل: جب تک گنہگار کو موقع نہ دیا جائے کہ وہ پھر اچھے کام کرے تب تک ایشور کی اپار دیالوتا (غیر محدود مہربانی) کا ظہور نہیں ہوسکتا۔

پانچویں دلیل: روحوں کا جسم میں آکر مختلف قسموں کے سکھوں، دکھوں کو بھوگنا صاف ظاہر کرتا ہے کہ یہ ان کے ہی مختلف کرموں کا نتیجہ ہے ورنہ سب روحوں کو ایک قسم کے نتائج

---

(۱) آواگون، ص: ۳۸

(۲) کلیات آریہ مسافر، ص: ۸۰

(۳) آو گمن، ص: ۵۰

ملتے ،کیوں کہ پر میشور مُنْصِفْ ہے۔ایک لڑکے کا تندرست پیدا ہونا دوسرے کا اندھا، لولا، لنگڑا اور کوڑھی پیدا ہونا تناسخ کو ثابت کرتا ہے۔ [1]

تناسخ کے اثبات میں اس کے علاوہ اور بھی دلیلیں دی گئی ہیں طوالت کے باعث ہم ان سے صرف نظر کرتے ہیں، بیان مذہب کے لیے اسی قدر ذکر کافی وشافی ہے۔ان تمام دلائل پر کلام کیا جاسکتا ہے لیکن یہ محل اس کی اجازت نہیں دیتا۔

ہندوازم میں ویدوں کے الہامی ہونے کا نظریہ: ہندو عقیدہ کی رو سے چاروں وید آسمانی اور الہامی کتابیں ہیں، جو اگنی، وایو، آینیہ اور انگرہ چار رشیوں پر نازل کی گئیں، سوامی جی سوال و جواب کے انداز میں لکھتے ہیں:

سوال: کن کے آتما میں ویدوں کا نزول ہوا؟

جواب: دنیا کی پیدائش کے آغاز پر پرماتما نے اگنی، وایو، آینیہ اور انگرہ چار رشیوں کی آتما میں ایک ایک وید نازل کیا۔

اس کے بعد پنڈت جی ایسی باتیں لکھتے ہیں جن سے وید بھی آواگون کے چکر میں پھنستا ہوا نظر آتا ہے۔

سوال: ایشور عادل ہے یا جانب دار؟

جواب: عادل۔

سوال: جب پرمیشور منصف ہے تو سب کے دلوں میں ویدوں کا پرکاش کیوں نہیں کیا؟ صرف چار رشیوں کے دلوں میں پرکاش کرنے سے ایشور جانب دار ٹھہرتا ہے؟

جواب: اس سے ایشور پر جانب داری کا الزام ہرگز عائد نہیں ہوتا بلکہ یہ تو منصف ایشور کا کھلا ہوا انصاف ہے؛ اس لیے کہ انصاف اس کو کہتے ہیں کہ عامل کو اس کے اعمال کے لحاظ سے جزا دی جائے۔ اب جاننا چاہیے کہ انھیں چاروں پُرشوں کے پچھلے جنم کے اعمال ایسے تھے کہ

(۱) مرجع سابق، ص: ۴۸

ان دلوں میں ویدوں کا پر کاش کیا گیا۔

اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ چاروں رشی تو دنیا کے شروع ہی میں پیدا ہوئے تھے تو ان کے پچھلے جنم کے اعمال کیوں کر ثابت ہوئے؟ ماسبق میں یہ گزر چکا کہ دنیا کی پیدائش کے آغاز میں چار رشیوں کے آتما میں ویدوں کا پر کاش کیا گیا۔ اس کا جواب سوامی جی یہ دیتے ہیں:

جیو (روح) اور جیووں کے افعال، اور یہ دنیا تینوں لاابتدا ہیں، یعنی ازلی ہیں، روح اور مادہ اپنی ذات سے لاابتدا ہیں۔ اور افعال و دنیا، پرواہ (تسلسل) کی وجہ سے لاابتدا ہیں۔ [1]

سوامی رام سکھ داس گیتا نے گیتا کے حوالے سے چند اشلوک لکھے ہیں، ان کا پیش کر دینا ان کے نظریہ تناسخ کو اور مستحکم کر دیتا ہے عنوان سے اس کی جزئی مطابقت ہو جاتی ہے۔

वह हमारे से दूर नहीं है। हम चौरासी लाख योनियों में चले जायें तो भी भगवान हमारे हृदय में रहेंगे। स्वर्ग या नरक में चले जायें तो भी वह वमारे हृदय में रहेंगे। पशु या वृक्ष आदि बन जायें तो भी वह हमारे हृदय में रहेंगे।[2]

یہاں تک چند بنیادی عقائد کا ذکر ہم نے اجمال کے ساتھ کر دیا، مقالہ لکھتے وقت ہمارے سامنے اس مذہب کی بنیادی اور مستند کتابیں نہیں ہیں، اس لیے ان تمام گوشوں پر سیر حاصل گفتگو نہیں ہو سکی اگر مآخذ کی کتابیں دستیاب ہو جائیں تو براہ راست ان کی فکر کو سمجھنے میں اور آسانی ہوگی، اللہ تعالی سے دعا ہے کہ وہ میری اس حقیر کاوش کو قبول فرمائے اور حق کو باطل سے آشکار کرنے کی توفیق مرحمت فرمائے!

(۱) رگ ویدادی بھاشیہ بھومیکا، ص:۳۱، ۳۲

(۲) तू ही तू 43

فقہ اور قیاس کا ثبوت کتاب اللہ اور احادیث کی روشنی میں

محمد رضا قادری مصباحی
متخصص فی الفقہ الحنفی
الجامعۃ الاشرفیہ، مبارک پور
محررہ: ۷ر فروری ۲۰۰۹ء

فقہ کی تعریف: الفقه لغةً الضَمُّ والأصول: العلم بالأحكام الشرعية عن أدلتها التفصيلية (توضیح وعامہ، کتب فقہ واصول)

فقہ کی اصل، کتاب اللہ اور احادیث مصطفی ﷺ میں ہے۔ اللہ تعالی ارشاد فرماتا ہے:
وَ مَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً فَلَوْ لَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَ لِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ (توبہ، آیت ۱۲۲)

اور مسلمانوں سے یہ تو نہیں ہوسکتا کہ سب کے سب نکلیں، تو کیوں نہ ہو کہ ان کے ہر گروہ میں سے ایک جماعت نکلے کہ دین کی سمجھ حاصل کریں۔ اور واپس آکر اپنی قوم کو ڈر سنائیں، اس امید پر کہ وہ بچیں۔ (کنزالایمان)

دوسرے مقام پر ارشاد ہے: وَ مَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا (سورۃ البقرۃ، ۲۶۹) اور جسے حکمت ملی اسے بہت بھلائی ملی۔ (ک)

صاحب تفسیر خزائن العرفان فرماتے ہیں: حکمت سے یا قرآن و حدیث و فقہ کا علم مراد ہے یا تقوی یا نبوت (مدارک وخازن)

امام بخاری حضرت معاویہ رضی اللہ تعالی عنہ سے راوی ہیں: مَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَيْرًا يُّفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ جس کے ساتھ اللہ تعالی خیر کا ارادہ فرماتا ہے اسے دین کی سمجھ عطا فرماتا ہے۔

یہ پوری حدیث بخاری میں اس طرح ہے: قال حُميد بن عبدالرحمن

سمعتُ معاویة رضي الله تعالی عنه خطیبا یقول سمعت النبي صلی الله علیه و سلم یقول من یرد الله به خیرا یفقهه في الدین۔ (بخاری، کتاب العلم، حدیث:٦٠)

نکتہ: خیراً نکرہ ہے اور سیاق شرط میں واقع ہونے کی وجہ سے عموم کا افادہ کرتا ہے، تو معنی یہ ہوا کہ اللہ عزوجل جسے تمام دنیا و آخرت کی بھلائی عطا فرمانا چاہتا ہے اسے فقیہ بناتا ہے۔ اور اگر تنوین برائے تعظیم لیں تو معنی ہوگا بہت بھلائی عطا فرماتا ہے۔ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ افراد میں سب سے افضل فقیہ ہوتا ہے۔ اس لیے ایک حدیث شریف میں وارد ہے: فَقِیْهٌ وَاحِدٌ أَشَدُّ عَلَی الشَّیْطَانِ مِنْ أَلْفِ عَابِدٍ۔ رواہ الترمذي و ابن ماجه و أخرجه الشیخ ولي الدین محمد بن عبداللہ الخطیب التبریزی فی المشکوۃ۔ ایک فقیہ، ہزار عابد غیر فقیہ سے زیادہ شیطان پر بھاری ہے۔

مندرجہ بالا آیات و آثار سے معلوم ہوا کہ فقہ ایک عظیم نعمت ہے جو من جانب اللہ بندوں کو عطا کی جاتی ہے، اور فقیہ اسے کہا جائے گا جسے کتاب و سنت اور اجماع امت کی روشنی میں مسائل شرعیہ فرعیہ کے استنباط پر قدرت حاصل ہو اور انھیں مصادر احکام کی روشنی میں غیر منصوص مسائل کے احکام کا استخراج بھی کر سکے۔

حضرت عبد اللہ ابن مسعود رضی اللہ تعالی عنہ سے روایت ہے: سرکار مدینہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: نَضَّرَ اللهُ عَبْدًا سَمِعَ مَقَالَتِيْ فَحَفِظَهَا وَ وَعَاهَا وَ أَدَّاهَا فَرُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ غَیْرُ فَقِیْهٍ وَ رُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ إِلٰی مَنْ هُوَ أَفْقَهُ مِنْهُ۔ رواہ أحمد و الترمذي وابن ماجه والدارمي عن زید بن ثابت رضي اللہ تعالی عنه۔

اس بندے کو اللہ عزوجل تر و تازہ رکھے جس نے میرے ارشاد کو سنا، پھر یاد رکھا اور محفوظ کیا اور دوسروں تک پہنچایا۔ بہت سے فقہ کے حامل فقیہ نہیں ہوتے اور بہت سے فقہ کے حامل سے زیادہ فقیہ وہ ہوتا ہے جس کو اس نے پہنچایا۔

اس حدیث سے جہاں حفظِ حدیث کی فضیلت ثابت ہوتی ہے وہیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حدیث کا یاد رکھنا اور ہے اور اس کو شارع کی منشا کے مطابق سمجھنا اور ہے۔ اسی لیے علما

فرماتے ہیں: محدث کے لیے فقیہ ہونا ضروری نہیں البتہ فقیہ کے لیے محدث ہونا ضروری ہے۔

فقہ کی ضرورت کیوں پڑی: تمام علمائے اہلسنت و جماعت کا اس پر اتفاق ہے کہ قانون اسلامی کا اولین منبع کتاب الہی، قرآن مجید ہے۔ پھر دوسرا مصدر سنت رسول علیہ الصلوٰۃ و السلام، اور تیسرا ماخذ، اجماع امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوۃ والسلام ہے۔

قرآن مقدس جو احکام کا پہلا منبع ہے جس کو اللہ تعالی نے حضور رحمت دو جہاں ﷺ کے قلب منیر پر نازل فرمایا، اس میں اللہ تعالی نے آغاز آفرینش سے لے کر اس کائنات کی انتہا تک کے سارے علوم جمع کر دیے، ہر چیز کا روشن بیان، ہر ذرے کی تفصیل اللہ تعالی نے بیان فرمادی۔ **فِيْهِ تِبْيَانٌ لِّكُلِّ شَيْءٍ** اس میں ہر چیز کا واضح بیان ہے۔ **مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِن شَيْءٍ** اس کتاب میں ہم نے کسی چیز کا ذکر نہ چھوڑا۔ **وَ كُلَّ شَيْءٍ فَصَّلْنٰهُ تَفْصِيْلًا**۔ ہم نے ہر چیز کی خوب تفصیل بیان فرمادی۔ یہاں تک کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالی عنہما فرماتے ہیں: **لو ضاع لي عقال بعير لوجدته في كتاب الله**۔ اگر میری اونٹ کی رسی گم ہوجائے تو میں اسے کتاب اللہ میں تلاش کرلوں گا۔

ان تمام آیتوں پر ہمارا ایمان ہے۔ لیکن ذہن انسانی میں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب قرآن مقدس میں ہر شئ کا واضح بیان ہے ہر مسئلے کا حکم موجود ہے تو احادیث رسول کی کیا ضرورت؟ کیا انسانی ہدایتوں کے لیے اللہ کا کلام کافی نہیں؟

تو اس کا بہتر جواب یہ ہے کہ واقعی قرآن تبیانا لکل شئ ہے مگر ہر فرد بشر کے لیے نہیں، بلکہ اس کے لیے جس پر یہ قرآن نازل ہوا ہے۔ لہذا فہم قرآن میں ہم رسول ﷺ کے محتاج ہوئے اور نبی کی وساطت کے بغیر ہم معانئ قرآن کو نہیں سمجھ سکتے۔ اس لیے کہ قرآن میں ہمیں نماز، روزہ، حج، زکوۃ، رکوع، سجود وغیرہ کے احکام تو ملتے ہیں لیکن ان کی تفصیل نہیں ملتی کہ نماز کس طرح ادا کریں، فجر میں کتنی رکعت پڑھیں اور ظہر میں کتنی، کن وقتوں میں جہرًا قراءت کریں اور کن نمازوں میں سرًّا، ہاتھ کہاں باندھیں، رکوع میں کیا پڑھیں اور سجدے میں کیا پڑھیں، رمضان میں روزہ کتنے دن تک رکھیں، حج کے طریقے کیا ہیں، اور عمر میں کتنی بار حج فرض ہے، اس کے فرائض و واجبات کیا ہیں،

زکوۃ سال میں کتنی بار ادا کی جائے اور کس طرح کے مال پر زکوۃ فرض ہے، کس پر نہیں، کتنے میں کتنا ادا کریں، رکوع کیسے کریں سجدہ کیسے کریں؟ ان ساری چیزوں کی تفصیل آپ کو قرآن میں نہیں ملے گی۔ اسی طرح قرآن کی بعض آیات مجمل ہیں بعض خفی، بعض مشکل اور بعض متشابہ، اور بعض ناسخ ہیں بعض منسوخ ان سب کا بیان حدیث رسول میں ملے گا۔ اگر اسلام کے قانون پر چلنا ہے تو بارگاہ رسول میں حاضری دینی پڑے گی۔ ان سارے امور کی تفصیل احادیث نبوی میں ملے گی، اسی لیے اللہ تبارک و تعالی نے اپنے نبی کی صفت قرآن میں یہ بیان فرمائی ہے **وَ اَنْزَلْنَا اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْھِمْ**۔ اور ہم نے آپ کی طرف قرآن اتارا تاکہ آپ لوگوں کے سامنے اس کا واضح بیان کر دیں جو ان کی طرف نازل کیا گیا۔

اور دوسرے مقام پر یہ صفت بیان کی گئی ہے **یَتْلُوْ عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ وَ یُزَکِّیْھِمْ وَ یُعَلِّمُھُمُ الْکِتَابَ وَ الْحِکْمَۃَ**۔ یہ رسول ان پر اللہ کی آیتیں تلاوت کرتا ہے اور انھیں پاک کرتا ہے اور انھیں کتاب و حکمت سکھاتا ہے۔ (سورہ نسا، آیت: ۱۶۴)

اس سے پتہ چلا کہ سنت رسول کے بغیر کتاب اللہ پر عمل ممکن نہیں۔ لہذا جو لوگ اہل قرآن ہونے کا دعوی کرتے ہیں اور سنت کو قابل عمل نہیں سمجھتے وہ قرآن پر بھی عمل نہیں کر سکتے ہیں۔

سنت رسول اللہ ﷺ: یہ ہم نے مان لیا کہ فہم قرآن فہم حدیث کے بغیر ممکن نہیں۔ جب سرکار نے اپنی احادیث میں تمام احکام شرعیہ کو بیان فرمادیا اور امت کے تمام مسائل کا حل پیش فرمادیا تو کیا پھر کسی چیز کی حاجت باقی رہ جاتی ہے؛ کیوں کہ اگر یہ کہا جائے کہ سرکار نے تمام احکام بیان نہیں فرمائے ہیں تو لازم آئے گا کہ دین کو مکمل طور پر آپ نے پیش نہیں فرمایا اور زندگی کے ہر شعبے میں آپ کی ہدایت کافی نہیں اور بعض مسائل ابھی تشنۂ احکام ہی ہیں اور یہ باطل ہے۔

شرع سے نابلد کچھ افراد بالخصوص غیر مقلدین، بے پڑھے یا کم پڑھے لکھے سنی مقلدین مسلمانوں کے ذہنوں میں یہ بات اتارنے کی کوشش کرتے ہیں کہ جب کتاب و سنت میں ہر

مسئلے کا واضح بیان ہے اور ہر چیز کا روشن بیان آگیا ہے تو پھر کسی کی رائے یا قیاس پر عمل کی کیا ضرورت ہے؟ کیا ہمارے لیے اللہ عزوجل کی کتاب اور سرکار کی احادیث کافی نہیں؟ کہ ہم کسی تیسرے مصدر سے احکام حاصل کریں۔

یقیناً ان کا یہ سوال اپنے اندر بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ آئیے ہم سب مل کر بیداریٔ ذہن کے ساتھ اس سوال کا حل تلاش کریں۔

معانیِ حدیث کی فہم: یہ ہمیں تسلیم ہے کہ قرآن و احادیث میں قیامت تک پیدا ہونے والے تمام مسائل کے حل موجود ہیں تمام پیدا شدہ یا جو پیدا ہونے والے مسائل ہیں ان کی اصل موجود ہے۔

لیکن کتاب مقدس اور احادیث نبویہ میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن و حدیث کے معانی کا سمجھنا ہر شخص کا کام نہیں۔ اور نہ سب کے اندر یہ صلاحیت ہے کہ وہ کتاب و سنت سے مسئلے کا حل نکال سکیں۔ ابھی حدیث شریف میں بیان ہوا کہ اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے اسے دین کی سمجھ عطا فرماتا ہے۔ بخاری، کتاب العلم میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ارشاد ہے: **فهم أعطيه رجل مسلم**۔ ج: اول، ص: ۲۱۔ سمجھ جو کسی مسلمان کو دی گئی ہو۔ اور یہی سمجھ جب کسی کو مل جاتی ہے تو وہ فقیہ ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے سرکار نے کسی صحابی کے لیے دعا فرمائی، غالباً حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما ہیں: فرمایا تھا: اللهم علمه الكتاب وفقهه في الدين أو كما قال۔ اے اللہ انھیں کتاب کا علم اور دین کی سمجھ عطا فرما۔ اس سے یہ سمجھ میں آیا کہ کتاب کا علم اور فقہ دونوں علیحدہ چیزیں ہیں۔

لہٰذا فقہ کے بغیر احادیث رسول پر بھی عمل ممکن نہیں۔ جب تک سرکار حیات ظاہری میں امت کے درمیان تشریف فرما رہے لوگ براہ راست مصدر احکام سے مسئلے کا حکم معلوم کر لیتے لیکن حضور ﷺ کی حیات ظاہری کے بعد یہ صورت ممکن نہ رہی اس لیے ضرورت پڑی کہ غیر منصوص مسائل میں اجتہاد کیا جائے۔

فقہ کے بغیر حدیث پر عمل ناممکن ہے: میرے اسلامی بھائیو! اسلام ایک مکمل نظام زندگی

ہے۔ مکمل دستور حیات ہے۔ پیدائش سے لے کر موت اور مابعدالموت تک اسلام کی رہنمائیاں بہت واضح ہیں۔ اسلام ہی ایساعالمگیر مذہب ہے جس میں زندگی کا کوئی گوشہ، اور انسانیت کا کوئی طبقہ محروم قانون اور تشنۂ قانون نہیں ہے۔ اسلام ایک آسمانی مذہب ہے۔ اسلام کے قوانین کسی انسانی ذہن کی اختراع نہیں، بلکہ اس کا مقنن خود کارساز کائنات ہے۔ اسی لیے ہمارامذہب کسی ایک زمانے کے لیے نہیں ہے بلکہ اس کا قانون ہر زمانے اور ہر عصر کے لیے ہے۔ اور ہمیں کامل یقین ہے کہ اس کے اندر قدیم اور جدید تمام تقاضوں کو پورا کرنے کی بھرپور صلاحیت ہے۔

جب اسلام کے بارے میں یہ نظریہ ہے کہ ہمارامذہب قیامت تک کے مسلمانوں کے لیے ہدایت فراہم کرنے والا ہے۔ تواب آپ غور کریں بتدریج یہ قانون فطرت ہے کہ حوادث اور اشیا کا وجود یکبارگی نہیں ہوگیا بلکہ تدریجًا ہوا ہے اور بتدریج ہوتا بھی رہے گا۔ اور یہ نئی نئی چیزیں، نئی ایجادات اور یہ حوادث جو آج رونما ہو رہے ہیں سرکار کے زمانے میں نہیں ہوئے تھے۔ اسی طرح لاکھوں اور کروڑوں چیزیں جو صبح قیامت تک عالم امکاں میں رونما ہوتی رہیں گی عہد رسالت میں نہیں تھے۔ تو یہ بہت مشکل تھا کہ سرکار دوعالم ﷺ قیامت تک رونما ہونے والی تمام اشیا اور حوادث کا حکم نام بنام صراحت کے ساتھ ارشاد فرمادیتے۔ بہت ساری چیزیں ہمیں ایسی ملتی ہیں کہ جن کے بارے میں قرآن وحدیث میں ہمیں کوئی صریح حکم نہیں ملتا۔ بعض چیزوں کے بارے میں ملتا ہے اور یہ بعض چیزیں جن کی صراحت حدیث یا قرآن میں ہے بہت تھوڑی ہیں ان اشیا کی طرف نظر کرتے ہوئے جو ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں وقوع پذیر ہیں۔

وجہ یہ ہے کہ انسان کی معاشرت کی وسعت نے انسان کو اتنی چیزوں کا محتاج بنادیا ہے کہ ایک آدمی لاکھ کوشش کرے کہ وہ دوسرے سے بے نیاز ہوجائے یہ محال ہے۔

اور شارع سے جب ان تمام اشیا کے احکام کی صراحت نہیں ہے تو آپ کیسے یہ دعوی کرسکتے ہیں کہ ہمارا اسلام زندگی کے ہر شعبے میں خواہ عبادات ہوں یا معاملات، ہر ہر قدم پر

ہماری رہنمائی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ دعوی اسی وقت ثابت ہو سکے گا جب آپ ہر مسئلے کی تفصیل شریعت کی روشنی میں ثابت کردیں، اور اگر ایسا نہیں تو پھر آپ کا دعوی باطل ہے۔

یہ بہت ہی مشکل مقام ہے بہت ہی نازک موڑ ہے۔ اس مقام پر پہنچنے کے بعد بڑے بڑے مدعیان اہل حدیث کے شعور کے چراغ گل ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اور فقط ظاہر حدیث یا کتاب پر نگاہ رکھنے والا وادی ظلمات میں بھٹکنے لگتا ہے۔ یہ اسلام کی عالمگیریت پر بہت بڑا سوالیہ نشان ہے؟

اللہ کا بڑا فضل و احسان ہے کہ اسلام کے بارے میں ہمارا عقیدہ اتنا کچا اور کمزور نہیں ہے قرآن و سنت پر جیسا ایمان ہمارا ماضی میں تھا اب بھی ہے۔ یقیناً اس کے اندر تمام چیلینجوں کا جواب اور ہر مسئلے کا حل موجود ہے۔

اس عقد لاینحل کے حل کے لیے ضرورت پڑی قیاس اور اجتہاد کی۔

قیاس کہتے ہیں اندازہ کرنے کو اور اصولیین کی اصطلاح میں حکم غیر منطوق کو حکم منطوق کے موافق کرنا کسی علت مشترکہ کی بنیاد پر۔ یعنی کتاب و سنت یا اجماع میں کسی شے کے حکم کی صراحت نہیں ہے کہ وہ حلال ہے یا حرام، جائز ہے یا ناجائز تو اب کوئی ایسی مثال تلاش کریں گے جو اس کے مماثل اور مساوی ہو اور اس کا حکم مصادر ثلاثہ میں سے کسی سے معلوم ہو تو ان دونوں کے درمیان کوئی علت تلاش کی جائے گی جو مشترک ہو۔ پھر غیر منصوص پر بھی وہی حکم لگائیں گے جو منصوص کا ہے۔

اس کو درج ذیل مثال سے سمجھیں۔ بیع اور ربا (سود) کی حلت و حرمت کے بارے میں قرآن حکیم میں ارشاد ہے: اَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰو۔ اللہ نے بیع کو حلال کیا اور سود کو حرام۔ اس آیت سے بیع کی حلت اور ربا کی حرمت کا ثبوت ہوا۔ لیکن صحتِ بیع کے شرائط کیا ہیں؟ بیع کے طریقے کیا ہیں؟ ان ساری باتوں کی تفصیل قرآن میں نہیں ہے، اسی طرح سود حرام ہے تو سود کا تحقق کب ہوگا؟ اور سود کن دو چیزوں کے درمیان پایا جائے گا اس کی صراحت کتاب اللہ سے نہیں ہوتی۔ تو یہ آیت سود کے بارے میں مجمل ہے اور اس کی

تبیین وتوضیح حدیث سے ہوتی ہے۔ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اَلْحِنْطَةَ بِالْحِنْطَةِ وَ الشَّعِيْرَ بِالشَّعِيْرِ وَ التَّمَرَ بِالتَّمَرِ وَ الْمِلْحَ بِالْمِلْحِ وَ الذَّهَبَ بِالذَّهَبِ وَ الْفِضَّةَ بِالْفِضَّةِ سَوَاءً بِسَوَاءٍ يَدًا بِيَدٍ وَ الْفَضْلُ رِبٰوا ۔ گیہوں گیہوں کے بدلے، جو جو کے بدلے، کھجور کھجور کے بدلے، سونا سونے اور چاندی کو چاندی کے بدلے، برابر برابر، دست بدست، بیچو اور زیادتی سود ہے۔

مذکورہ حدیث میں شارع علیہ السلام نے چھ چیزوں کا ذکر فرمایا کہ اگر ان چیزوں کو ایک دوسرے کے ساتھ بیچنا ہو تو برابر برابر اور دست بدست بیچو اور کسی جانب تھوڑی بھی زیادتی پائی گئی تو وہ سود ہے اور سود حرام ہے۔ احادیث مبارکہ میں مذکور ان اشیائے ستہ کے علاوہ اور دیگر چیزوں میں سود کا تحقق ہوگا یا نہیں اس کی صراحت نہیں ملتی۔ تو کیا یہ کہا جائے کہ سود کا تحقق انھیں چھ چیزوں گیہوں، جو، کھجور، نمک، سونا اور چاندی میں منحصر ہے اور ان کے علاوہ میں زیادتی کے ساتھ بیع و شرا جائز ہے؟ اگر اس بات کو مان لیا جائے تو شرع پر بہت بڑی زیادتی ہوگی اور لازم آئے گا کہ دھان، چاول، چنا، مٹر، ارید، باجرہ، مغز بادام، لوہا، پیتل، تانبا اور روپے پیسے اور اِن کے علاوہ بہت ساری چیزوں میں تفاضل کے ساتھ بیع جائز ہو۔ اور روپے پیسے میں آج جو سودی نظام قائم ہے وہ سب جائز و درست ہو۔ اس لیے کہ حدیث میں صرف سونے اور چاندی کا ذکر ہے اور ہمارے یہاں آج جو کرنسی نوٹ اور پیسے جاری ہیں ان کا ذکر نہیں ہے۔ حالاں کہ کوئی بھی سچا مسلمان اس کا قائل نہیں کہ روپے پیسے دھان چاول وغیرہ میں سود کا تحقق نہیں ہوگا۔ مثال کے طور پر ایک آدمی دوسرے کو ۱۰۰/ روپے بطور قرض کے دے یہ کہ کر کہ ایک مہینے بعد تمھیں ایک سو پانچ روپے دینے پڑیں گے۔ اب غیر مقلدین جو کسی فقہ کو نہیں مانتے یہ بتائیں کہ اس صورت میں پانچ روپے جو اصل پر زیادتی کے ساتھ لے رہا ہے وہ سود ہے یا نہیں۔ وہ بھی یہی کہنے پر مجبور ہوں گے کہ یقیناً یہ سود ہے۔

اب میں ان سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ ان میں سود ہے؟ کیا قرآن کی کسی آیت یا حدیث کے کسی ٹکڑے سے صراحۃً اس کا سود ہونا دکھا سکتے ہیں؟ راقم

پورے وثوق کے ساتھ کہتا ہے کہ وہ قیامت تک اس کو نہیں دکھا سکتے۔ حالاں کہ ان کا ایمان ہے کہ قرآن و حدیث میں اس کا حکم موجود ہے۔ تو فطری طور پر انسان مجبور ہوا کہ اس حکم کو وہ نکالے۔ اب نکالنے کا مرحلہ بھی بڑا مشکل ہے ہر انسان کے بس کی بات نہیں کہ وہ کتاب و سنت سے استنباط مسائل کر سکے۔ اس لیے کہ استنباط مسائل کے لیے ضروری ہے کہ اس شخص کو ۵۰۰ ر آیات احکام، شان نزول اور تفسیری روایات کے ساتھ یاد ہوں، اسی طرح احادیث سے کم از کم تین ہزار احادیث احکام مع جرح و تعدیل اسے از بر ہوں، فقہ و اصول فقہ میں مہارت رکھتا ہو پھر کہیں جاکر وہ اجتہاد کرنے کا اہل ہو سکتا ہے۔ اور ان شرائط کا حامل ہونا متعذر با لہذا ہر شخص استنباط و استخراج مسائل کا نہ اہل ہو سکتا ہے نہ مکلف۔ ان عبارتوں سے ثابت ہوا کہ قیاس و اجتہاد کے بغیر انسانی زندگی کے مسائل حل نہیں ہو سکتے اور یہ دروازہ ان شاء اللہ قیامت تک کھلا رہے گا۔ جو لوگ ہر زمانے میں اس کار عظیم کو انجام دیتے ہیں انھیں اصطلاح میں ''فُقہا'' کہا جاتا ہے۔

سائنسی مضامین

اسلام اور جدید میڈیکل سائنس

محمد رضا قادری مصباحی
پرنسپل: جامعہ حضرت نظام
الدین اولیاء
ذاکر نگر، نئی دہلی

دور جدید میں مسلمان، نت نئے انکشافات اور میڈیکل سائنس کے میدان میں غیر مسلموں کے غیر معمولی کارناموں سے مرعوب نظر آتے ہیں اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ عصر حاضر کی تمام تر طبی و سرجری دریافت غیر مسلم اطبا کی بدولت ہوئی ہے، جب کہ اسلام اور مسلمانوں کا اس میں کوئی حصہ نہیں۔ ایسی فکر کے حاملین سخت ذہنی اضطراب میں مبتلا ہیں۔ ایسا ذہن رکھنے والے انسان کے اندر یہ سوچ پیدا ہوتی ہے کہ اسلام میں عصر جدید کے تقاضوں کو حتمی شکل میں پورا کرنے کی صلاحیت نہیں۔ حالاں کہ اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ سے واقفیت رکھنے والوں پر یہ بات مخفی نہیں کہ میڈیکل سائنس کے میدان میں اسلام اور مسلمانوں کی خدمات ناقابل فراموش ہیں، بلکہ یہ کہنا بجا ہوگا کہ جدید طبّی تحقیقات کی تمام تر عمارتیں اسلامی اطبا کے ذریعہ فراہم کردہ اساس پر کھڑی ہوئی ہیں۔ جس کو مزید اضافے کے ساتھ آج نئی نئی شکلیں دے دی گئی ہیں۔

ذیل میں احادیث کریمہ کے حوالے سے طب اور سرجری سے متعلق کچھ اصول پیش ہیں:

بخار کا علاج: انسانی جسم عموماً ۱۰۵، ۱۰۶ درجہ فارن ہائٹ سے زیادہ ٹمپریچر کو برداشت کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ انسانی جسم کا درجۂ حرارت اگر اس حد سے تجاوز کر جائے تو صرف اس کی حدت کی زیادتی سے بھی موت واقع ہو سکتی ہے، ایسے وقت میں ضروری ہے کہ اس کے درجۂ حرارت کو اعتدال پر لایا جائے۔

طب جدید، جسے آج میڈیکل سائنس کے نام سے جانا جاتا ہے اس کی رو سے ایسے مریض

کے جسم کو پہلے برف کے پانی سے بھگودینا چاہیے اور جسم پر گیلے کپڑے کی پٹیاں رکھنی چاہیے تاکہ اس کی برودت کی وجہ سے جسم کا درجۂ حرارت کسی قدر اعتدال پر آجائے

اب آئیے اس باب میں رسول گرامی و قار ﷺ کا طبابت سے لبریز ارشاد ملاحظہ کریں: " اَلْحُمّٰى مِنْ فَيْحِ جَهَنَّمَ فَأَبْرِدُوْهَا بِالْمَاءِ "بخار جہنم کی لپیٹ سے ہے لہذا اس کو پانی سے ٹھنڈا کرو۔ (بخاری، کتاب الطب، ج:۲، ص:۸۵۲)

إِنَّ شِدَّةَ الْحُمّٰى مِنْ فَيْحِ جَهَنَّمَ فَأَبْرِدُوْهَا بِالْمَاءِ۔ بخار کی شدت جہنم کی لپٹ سے ہے اس لیے اس کی گرمی کو پانی سے بجھاؤ۔

پانی سے بخار کا علاج آج فطری طریقہ علاج بن چکا ہے جسے شہر و دیہات ہر جگہ اختیار کیا جارہا ہے میڈیکل سائنس کا یہ علاج دراصل فرمان نبوی سے ماخوذ ہے۔

آپریشن کے ذریعہ علاج: کبھی کبھی مرض کی نوعیت اس قدر مشکل ہو جاتی ہے کہ عام علاج سے افاقہ ناممکن ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں آپریشن کا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے جسے آج جراحی کہتے ہیں۔ عصر جدید کا انسان سمجھتا ہے کہ اس طریقۂ علاج کی دریافت ہم نے کی ہے، اور صدیوں کی تحقیق کے بعد ہم نے اسے معلوم کیا ہے، اسلام کا اس میں کوئی حصہ نہیں جب کہ سچ یہ ہے کہ اس کا موجد بھی مسلمان ہے۔ سب سے پہلے طبیب انسانیت حضرت محمد مصطفی ﷺ نے آپریشن کے ذریعہ علاج کی بنیاد رکھی۔ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ طبیب انسانیت کا معمول بیان کرتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے دونوں مونڈھوں اور اخدعین (گردن کے دونوں طرف کی رگوں) کے بیچ میں تین سنگی کھنچوائے۔ (سنن ابی داؤد ۲ ص۱۸۴) عن ابن عباس قال: احتجم النبي صلى الله عليه و سلم و هو صائم۔ نبی کریم ﷺ نے روزہ کی حالت میں پچھنے لگوائے۔ (صحیح البخاری، ج۲، ص۸۴۹)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلام، جدید سائنس کا موجد

از: محمد رضا قادری مصباحی
پرنسپل: جامعہ حضرت نظام الدین اولیا، ذاکر نگر، نئی دہلی

اگر میں یہ کہوں کہ اسلام ہی جدید سائنس کا موجد ہے تو اس میں مبالغہ کی کوئی بات نہیں۔ یہ بات آج ایک مسلمہ حقیقت بن چکی ہے اور عصر حاضر کے بڑے بڑے مفکرین نے برملا اس کا اعتراف بھی کیا ہے، اے ہمبولٹ (A. Humboldt 1769-1859) نے کہا: یہ دراصل عرب ہیں جن کو صحیح معنوں میں فزکس کا بانی سمجھا جانا چاہیے "It is the Arbs who should be regarded as the real founder's physics"۔

اللہ عزوجل کی اس وسیع و عریض اور حسین و جمیل کائنات میں اس کی قدرت کے ہزاروں جلوے اور لاکھوں نشانیاں ہر سو بکھری پڑی ہیں جو اس بات کا اعلان کر رہی ہیں کہ اس خوب صورت کائنات کا ضرور کوئی خالق ہے، ورنہ صبح و شام کا آنا اور جانا، شمس و قمر اور کروڑوں سیارگان فلکی کا اپنے اپنے مدار میں مقررہ اوقات کے حساب سے گردش اور ہر ایک کے درمیان مناسب نظم و ارتباط اس طور پر کہ ایک سیارہ دوسرے سیارہ سے ٹکراتا نہیں یہ سب کسی خالق کے بغیر کیوں کر ممکن ہے!

قرآن مجید نے پہلی بار بنی نوعِ انسان کو انفس و آفاق کی گہرائیوں میں غوطہ زن ہونے کا حکم دیا۔ انسان کے خوابیدہ احساسات و ادراکات کو جھنجھوڑا اور بیدار کیا۔ فرمایا: **اَفَلَا تتفکرون، افلا تتدبرون، افلا تعقلون، افلا تَنْظُرون، افلا تُبْصرون** تم عقل و شعور اور بصیرت و بصارت سے کیوں نہیں کام لیتے؟

پہلی بار انسان کی قوت متخیلہ اور فکریہ کو مخاطب بناکر اس کائنات میں غور و فکر کرنے کا حکم دیا اسی تدبر و تفکر کا فیض تھا کہ دنیا کی اجڈ ترین قوم (عرب) خدائی احکام پر عمل پیرا ہونے کے بعد محض ایک صدی کے اندر اندر دنیا بھر کی امامت و قیادت کی حقدار ٹھہری اور اس نے

دنیا کو یونانی فلسفہ کی لاحاصل موشگافیوں سے آزاد کرتے ہوئے فطری علوم کو تجربے (Experiment) کی بنیاد عطا کی۔

آج سے کم و بیش ڈیڑھ ہزار سال پہلے بنی نوع انسان کے ذہن میں علم کے موجودہ عروج و ارتقا کا کوئی تصور بھی نہیں تھا۔ ذہن و فکر پر ارسطو کا فلسفہ، بطلیموسی اور فیثاغورسی نظریات چھائے ہوئے تھے۔ ایسے وقت میں اسلام کی آفاقی تعلیمات نے دور جاہلیت کا پردہ چاک کرتے ہوئے ہزارہا ایسے فطری ضوابط کو بے نقاب کیا جن کی صداقت پر عصر حاضر کا سائنسی ذہن بھی محو حیرت ہے۔ قرون وسطیٰ میں مسلم سائنس دانوں نے جو نمایاں کارنامے انجام دیے اور جن سائنسی علوم اور ٹکنالوجی کی فصل بوئی تھی آج وہ پک کر جوان ہو چکی ہے اور آج کی دنیا اسی کاشت کی گوناں گوں فصلوں سے فیضیاب ہو رہی ہے۔

اسلام اور چاند کا سفر

امریکی خلاباز نیل آرم اسٹرانگ (Neil Armstrong) پہلا انسان ہے جس نے چار روزہ خلائی سفر کے بعد ۲۰ر جولائی ۱۹۶۹ء کو چاند پر اپنا قدم رکھا اور وہاں پہنچ کر اس نے یہ تاریخی الفاظ کہے: کہ ایک انسان کے لیے یہ ایک چھوٹا قدم ہے مگر انسانیت کے لیے وہ ایک عظیم چھلانگ ہے۔ "That's one small step for a man, one grant leap for mankind"

امریکہ کے خلائی تحقیقاتی ادارہ ناسا (National Aeronautic Space Agency) کے تحت تین سائنس دانوں کے ذریعے تسخیر ماہتاب کا یہ عظیم ترین واقعہ پیش آیا۔

آرم اسٹرانگ اور ان کے ساتھی ایڈون آلڈرن (Edwin Aldrin) اور مائکل کولنس (Michal Collins) نے ایک مخصوص راکٹ اپالو (Apollo 11) پر سفر کیا اور آخری مرحلہ میں ایک چاند گاڑی کے ذریعہ سطح ماہتاب پر اترے۔ یہ برق رفتار راکٹ اور کمانڈ ماڈل گاڑی فطرت کے محکم قوانین کے تحت بنی ہوئی سائنسی مشینیں تھیں اور ان خلابازوں نے

انھیں قوانین فطرت کواستعمال کرکے یہ پوراخلائی سفر طے کیا۔

یہاں غور طلب پہلو یہ ہے کہ فطرت کا یہ قانون ہماری دنیامیں لاکھوں سال سے موجود تھامگر اس سے پہلے انسان کبھی یہ سوچ نہ سکا کہ وہ فطرت کے اس قانون کو جانے اور اس کو استعمال کرکے چاند تک پہنچنے کی کوشش کرے۔

فطری امکانات کے باوجود چاند تک پہنچنے میں تاخیر کا سبب کیا تھا؟ وہ سبب شرک تھا، یعنی مخلوق کو معبود سمجھ کراس کی پرستش کرنا۔ قدیم زمانہ میں لوگ مظاہر فطرت کو معبود سمجھ کر انھیں پوجتے تھے، ساری دنیامیں شرک کا عقیدہ چھایا ہوا تھا، روشن آفتاب و ماہتاب کو دیکھ کر اس کے ذہن میں اس کے آگے جھکنے کا خیال پیدا ہوتا تھا، نہ کہ اس کو فتح کرنے کا، ان مظاہر فطرت کو معبود سمجھ لینے کا عقیدہ ان کو مسخر کرنے کی راہ میں رکاوٹ بن گیا۔

ساتویں صدی عیسوی میں پہلی بار ایسا ہوا کہ اسلام کے ذریعہ وہ انقلاب آیا جس نے شرک کو مغلوب اور توحید کو غالب فکر بنادیا۔ یہ انقلاب اولا عرب میں آیا اس کے بعد ایشیا و افریقہ میں سفر کرتا ہوا یورپ پہنچا اور بحر اٹلانٹک کو پار کرتا ہوا امریکہ میں داخل ہوگیا۔

قرآن اور سائنس

تقسیم معجزہ: معجزہ کی دوقسمیں ہیں (۱) حسی جیسے چاند کا دو ٹکڑے کرنا (۲) معنوی جیسے قرآن مقدس، نیز معجزہ کبھی وقتی ہوتا ہے اور کبھی کچھ مدت کے لیے اور کبھی ہمیشہ کے لیے ہوتا ہے جیسے قرآن مجید۔

قرآن مجید باعتبار وجوہ اعجاز تین قسموں پر ہے:

(۱) زبان: ہر نبی اپنے اپنے دور میں وہ چیزیں ساتھ میں لے کر آئے جو اس دور کی قوم کے لیے سب سے اہم اور سبب تفاخر ہو، مثلا: دور موسوی میں جادوگری، اور سحر وطلسم، اور صالح علیہ السلام کے دور میں سنگ تراشی کر کے جانور بنانا، اور ہمارے نبی جس زمانے میں تشریف لائے وہ زبان وادب کا دور تھا، اہل عرب اپنے کو فصاحت وبلاغت کا تاجور سمجھتے تھے، نبی آخر الزماں، قرآن مقدس لے کر آئے جو تمام فصحا وبلغاے عرب کے تاجور ثابت ہوئے، جس نے لسانی عروج وکمال کی چوٹی پر رہنے والوں کو چیلنج کیا، **ام یقولون افتراہ قل فأتوا بعشر سور مثلہ مفتریات وادعو من استطعتم من دون اللہ**(ھود، ۱۳) قرآن مجید کے مثل دس سورتیں لے آؤ اور خداے تعالی کے علاوہ اپنے ہمنواؤں کو بھی جمع کرلو، جب وہ دس آیتیں بھی نہ لا سکے تو قرآن مجید نے پھر دوبارہ چیلنج کیا **فَأْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ**(البقرہ، ۲۳) اس کے مثل ایک ہی آیت لے آؤ۔ مگر وہ اہل زبان ہونے کے باوجود ایک آیت لانے سے بھی قاصر رہے۔

بعض لوگوں نے کلام الٰہی کی فصاحت وبلاغت اور اس کے کلام الہی ہونے کا انکار بھی کیا، مثلا ولید بن مغیرہ، عبداللہ بن مقفع، بالآخر ایک ایسا وقت بھی آیا کہ اعجاز قرآنی کا مشاہدہ کر کے خود انھیں حیرت ہوئی۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ولید بن مغیرہ نے دیکھا کہ ایک اعرابی آیت کریمہ: **فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ** پڑھ کر سجدہ ریز ہوگیا ہے۔ ولید بن مغیرہ نے کہا کیوں سجدہ میں گرے ہو اس نے جوابا کہا آیت مقدسہ کی فصاحت وبلاغت کو سجدہ کر رہا ہوں، اس

وقت اسے حیرت ہوئی۔ جب عبداللہ بن مقفع نے ایک بچے سے یہ آیت سنی تو اس پر لرزہ طاری ہوگیا۔آیت کریمہ یہ تھی: وَ قِيْلَ يٰاَرْضُ ابْلَعِيْ مَاءَكِ وَ يٰسَمَاءُ اَقْلِعِيْ وَ غِيْضَ الْمَاءُ۔

(۲) ثانی ماضی کی خبریں: یعنی حضور ﷺ کا بغیر پڑھے لکھے ہزاروں سال قبل کی خبر دینا یہ عقل کو عاجز کرنے والا امر ہے، ان اخبار قرآنیہ پر مستشرقین کا اعتراض ہے، ان کا یہ دعوی ہے مثلاً گولڈ زیہر مصنف "العقیدۃ و الشریعۃ فی الاسلام" کا کہ کلام اللہ جسے ہم مانتے ہیں وہ خدا کا کلام نہیں، اور اس پر گھٹیا اور رذیل دلیلیں دیں کہ ماضی کی جو خبریں قرآن میں ہیں وہ یا تو توریت و انجیل سے ماخوذ ہیں یا پھر گڑھی ہوئی باتیں، کیوں کہ یہ لوگ نبی کو امی نہیں مانتے، بلکہ عالم تسلیم کرتے ہیں، اور بطور دلیل حضور کے سفر شام وغیرہ کو پیش کرتے ہیں اور جو خبریں ماقبل کی کتابوں میں نہیں ہیں، مثلاً قوم لوط کے بارے میں " وَ جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَ اَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ" فرعون کے بارے میں "فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لتكون لمن حملتك آية" ان کو گڑھی ہوئی کہتے ہیں، مگر سو سال قبل جب زمینی تحقیقات کے ماہرین نے (Dead Sea) (یہ جارڈن اور اسرائیل کی سرحدوں کے درمیان واقع ہے) سے دور ایک پتھر کی دریافت کی جس پتھر کے ذرات خاکی نہیں تھے بلکہ آسمانی تھے یونہی مصر میں جب ایک جگہ ۱۵ یا ۲۰ لاشیں برآمد ہوئیں جس میں ایک لاش "رَرَسِّش" (زمانۂ موسوی کا فرعون) کی تھی تو ان آیتوں پر لگائے ہوئے الزامات دفع ہو گئے۔

(۳) مستقبل کی خبریں: مثلاً قیصر روم پر کسری کے حملہ کی خبر، اس کی تائید میں الٓمّ غُلِبَتِ الرُّوْمُ اور سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ جیسی آیتوں کو پیش کیا جاتا ہے۔

قرآن اور سائنس:

درحقیقت قرآن مجید اصل ہے اور سائنس فرع، مگر تطبیق کے وقت چند امور کو ملحوظ

رکھنا بے حد ضروری ہے:(۱) زمانۂ نزول میں معانیٔ الفاظ کیا تھے (۲) موضوع سے متعلق تمام آیتوں کو جمع کیا جائے (۳) نحو وصرف میں خاصہ ''درک''۔

جو لوگ قرآن کو فرع اور سائنس کو اصل سمجھتے ہیں اور قرآن میں وہ باتیں نہیں تلاش کر پاتے جو سائنس میں ہیں وہ بے جا قرآن میں تاویل کرتے ہیں، مثلا ''جوہر طنطاوی'' نے سَبۡعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا کی تاویل سات سیارے سے کی ہے جب کہ بعد میں تحقیق ہوئی کہ سیارے ۹ ہیں پھر بعد میں ۱۲ کا قول سائنس دانوں نے کیا، یونہی بعض لوگوں نے کہا کہ وَ یَقۡذِفُوۡنَ بِالۡغَیۡبِ سے فون کی طرف اشارہ ہے اور وَالۡبَحۡرِ الۡمَسۡجُوۡرِ سے عین مسجور مراد ہے وغیرہ۔

قرآن اور سائنس میں صحیح موافقت:

اس کی مثالیں یہ ہیں: (۱) وَ مَنۡ یُّرِدۡ اَنۡ یُّضِلَّہٗ یَجۡعَلۡ صَدۡرَہٗ ضَیِّقًا حَرَجًا کَاَنَّمَا یَصَّعَّدُ فِی السَّمَآءِ، جب اللہ تعالی کسی کو گمراہ کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اس کا دل تنگ فرما دیتا ہے گویا وہ آسمان میں چڑھ رہا ہے، اور سائنس بھی یہی کہتی ہے کہ جب انسان آسمان کی طرف چڑھتا ہے تو اس کا دل تنگ ہو جاتا ہے۔

(۲) وَ جَعَلۡنَا لَکُمُ السَّمۡعَ وَ الۡبَصَرَ وَ الۡفُؤَادَ میں پہلے سمع، پھر بصر پھر فواد کا ذکر ہے ایسی ترتیب کیوں ہے تو سائنس بھی اس کے بارے میں یہی کہتی ہے کہ پہلے کان تیار ہوتا ہے پھر آنکھ، پھر دل۔

(۳) شہد کی مکھی کے تعلق سے ہے: وَ اَوۡحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحۡلِ اَنِ اتَّخِذِیۡ مِنَ الۡجِبَالِ بُیُوۡتًا وَّ مِنَ الشَّجَرِ وَ مِمَّا یَعۡرِشُوۡنَ ثُمَّ کُلِیۡ مِنۡ کُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسۡلُکِیۡ سُبُلَ رَبِّکِ ذُلُلًا۔ خیال رہے کہ آیت کریمہ میں کلی، فاسلکی بصیغۂ تانیث خطاب ہے جب کہ چھتوں میں مذکر بھی ہوتے ہیں۔ سائنس نے بہت ہی تحقیق کے بعد یہ بتایا کہ پورے چھتہ میں صرف ایک مذکر ہوتا ہے بقیہ سارے مادے اور مؤنث ہوتے ہیں۔ یہ وہ آیتیں ہیں جن سے سائنس ملتی جلتی ہے اور یہ ساری باتیں سائنس کے وجود سے ہزار سال قبل ہی قرآن میں موجود ہیں۔

قرآن اور سائنس میں اختلاف کے وقت:

جہاں قرآن اور سائنس میں اختلاف ہو وہاں ہم یہ دیکھیں گے کہ یہ سائنسی انکشاف ظنی ہے یا حقیقی، اگر ظنی ہے تو سائنس کو چھوڑ دیا جائے گا، جیسے انسان کا وجود بندر سے ہے، اور اگر حقیقی ہے تو قرآن میں تاویل کی جائے گی جیسا کہ امام رازی نے **وَ جَعَلْنَا لَكُمُ الْاَرْضَ بِسَاطًا** میں تاویل کی ہے؛ کیوں کہ صارف قطعی کی وجہ سے قرآن میں تاویل جائز ہے؛ کیوں کہ امر واقعی اور حقیقی صارف قطعی ہے۔

قرآن مجید اور جدید سائنس

محمد رضا قادری
متعلم: الجامعۃ الامجدیۃ الرضویہ، گھوسی
مرقومہ: ۲۰۰۴ء

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی کتاب، مکمل ضابطۂ حیات اور تمام علوم کا خزینہ ہے، قرآن مجید علم وآگہی کا مخزن، اعلیٰ اخلاق کا معلم، مکمل دستور حیات اور فطرت انسانی کے عین مطابق ہے۔

قرآن مجید وہ کتاب ہدایت ہے جو انسان کی صحیح سمت رہنمائی کرتی ہے، وہ قانون ہے جس میں انسانیت کی تعمیر اور سوسائٹی کی تنظیم کے لیے صحیح ترین بنیادیں ہیں، یہ وہ کتاب حکمت ہے جس میں دانائی کی باتیں بھری ہوئی ہیں، وہ شفا ہے جس میں انسانیت کی بیماری کا علاج ہے، اس میں وہ یاددہانی ہے جو انسان کی سوئی فطرت کو جگاتی ہے۔ قرآن مجید وہ روشنی ہے جس سے انسانیت کے بھٹکے ہوئے قافلے راستے پاتے ہیں۔ غرض اس میں وہ سب کچھ ہے جس کی انسان کو ضرورت ہے۔ اس کے سوا کہیں سے آدمی کو کچھ نہیں مل سکتا۔

قرآن مجید واضح الفاظ میں انسان کو فکر و عمل کی دعوت دیتا ہے۔ قرآن مجید میں وہ طریقے بھی مندرج ہیں جو فی الحال ہماری نگاہوں سے اوجھل ہیں۔ یا کسی اور انداز میں پنہاں ہیں۔ قرآنی حقائق ایسے واضح دلائل ہیں کہ آج کی جدید سائنس بھی ان کی حدوں کے ادراک اور تعین کی دسترس نہیں رکھتی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم مسلمان سائنسی تحقیق کا رخ قرآنی علم کی روشنی میں ان اعلیٰ منزلوں کی طرف موڑ دیں جو اللہ نے بنی نوع انسان کے لیے مقرر کر رکھی ہیں۔

قرآن مجید کو چار بڑے عنوان کے تحت بیان کیا جاسکتا ہے (۱) روحانی علوم (۲) معاشرتی علوم (۳) سائنسی علوم (۴) لسانی علوم۔ دنیا کے ہر مذہب نے انسانی زندگی کو روحانی (SPRITUAL) اور مادی (MATERIAL) دو حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے لیکن قرآن مجید و فرقان حمید کی یہ منفرد خصوصیت ہے کہ وہ مذہب کے اسٹیج پر کھڑا ہو کر مادی

کائنات کے نظام کو اپنی صداقت کی تائید میں بطور شہادت پیش کرتا ہے۔

قرآن مجید اگرچہ سائنس کی کتاب نہیں اور نہ ہی سائنس کی تعلیم دینے یا بنی نوع انسان کو محض سائنسی معلومات کی فراہمی کے لیے نازل ہوا، تاہم قرآن مجید میں جابجا سائنسی حقائق کا ذکر کیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں سائنسی مظاہر اور عوامل، مثلاً تخلیق انسانی، تخلیق کائنات اور اس کا تشکیلی نظام، زمین اور ظہور زندگی، زمین کی پیدائشی ساخت، سطح اور اس کی ماہیت، ارتقاے حیات کے طبعی اور کیمیاوی مراحل، زندگی کے مبدا و آغاز، انسان کی پیدائش، انسانی توالد و تناسل، افزائش نسل کا انسانی نظام

ماہیت آسمانی، گردش لیل ونہار، اجرام فلکی کی گردش وغیرہ کے بارے میں ذکر بہت سے مقام پر ملتا ہے۔

تقریباسات سو آیات ایسی ہیں جو کسی نہ کسی طرح سائنسی عوامل اور مظاہر کے بارے میں ہیں، لیکن ہم ابھی بہت سی آیتوں کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔

نبی اکرم ﷺ کی آسمانوں پر تشریف آوری، اللہ تعالی سے ملاقات، اور پھر زمین پر واپس لوٹ آنا ہمیں بظاہر تو ایک انوکھا سا واقعہ لگتا ہے، لیکن بیسویں صدی کے سائنس، داں البرٹ آئن اسٹائن، نے سفر معراج کو بنیاد بناکر اپنا نظریۂ اضافت پیش کر کے تحقیقی سائنس کو ایک نئی جہت دی ہے۔

یہ ایک علمی حقیقت ہے کہ اسلام سائنس کا بانی ہے۔ سائنس سادہ طور پر مطالعۂ فطرت (Study of Nature) کا نام ہے۔

جدید سائنس خود اسلام کی پیدا کردہ ہے۔ اسلام بلا شبہ سائنس کے لیے نہیں آیا، مگر اس میں شک نہیں کہ سائنسی انقلاب خود اسلامی انقلاب کی ضمنی پیداوار ہے۔

اسلام اور سائنس کے اس تعلق کو بریفالٹ (Robert Briffault) نے ان الفاظ میں تسلیم کیا ہے۔

”ہماری سائنس پر عربوں کا قرض صرف یہ نہیں ہے کہ انھوں نے حیران کن نظریات

دیے۔ سائنس اس سے زیادہ عربوں کی مقروض ہے یہ خود اپنے وجود کے لیے ان کی احسان مند ہے"

آیئے! اب ساتھ ساتھ چند قرآنی آیات کا بھی جائزہ لیتے ہیں۔ قرآن مجید نوع انسانی سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اجرام سماوی کی ہر چیز کا غور سے مشاہدہ کریں۔

قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا تُغْنِي الْاٰيٰتُ وَ النُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ (سورۃ یونس، آیت:۱۰۱) اے محبوب ﷺ (ان کفار سے) کہو کہ دیکھو تو اس کو جو کچھ زمینوں اور آسمانوں میں ہے مگر جو لوگ ایمان نہیں رکھتے ان کے نشانیاں اور ڈراوے کچھ کام نہیں آتے۔

قرآن مجید برجوں کے مشاہدہ کرنے کی تاکید کرتا ہے۔

وَ لَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّ زَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِيْنَ اور بیشک ہم نے آسمانوں میں برج بنائے اور دیکھنے والوں کے لیے اس کو سجادیا۔ (سورۃ حجر، آیت:۱۶)

تَبٰرَكَ الَّذِيْ جَعَلَ فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّ جَعَلَ فِيْهَا سِرٰجًا وَّ قَمَرًا مُّنِيْرًا وہ ذات بڑی برکت والی ہے جس نے آسمانوں میں برج بنائے اور ان میں (آفتاب کا نہایت روشن) چراغ اور چمکتا ہوا چاند بنایا۔

قرآن مجید زمین کے مختلف شواہد کا مطالعہ کرنے کے بعد آغاز آفرینش کا کھوج لگانے کا مطالبہ کرتا ہے۔

قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ ثُمَّ اللّٰهُ يُنْشِئُ النَّشْاَةَ الْاٰخِرَةَ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (سورۃ عنکبوت، آیت:۲۰) آپ فرمادیجیے کہ زمین میں چلو پھرو اور دیکھو کہ اس نے کس طرح مخلوق کو پہلی دفعہ پیدا فرمایا۔ پھر خدا ہی پچھلی پیدائش کرے گا۔ بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

قرآن حکیم نے آغاز کائنات کا ایک خاص تصور دیا ہے۔ کائنات کے آغاز کے بارے میں یہ تصور انسان کے لیے بالکل نامعلوم تھا، اور نزول قرآن مجید کے زمانے میں تو اس کا تصور

بھی کسی کے ذہن میں نہیں گزر سکتا تھا۔ قرآن کا ارشاد ہے: اَوَلَمۡ یَرَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ کَانَتَا رَتۡقًا فَفَتَقۡنٰهُمَا (کیا یہ منکرین نہیں دیکھتے) کیا کافروں نے یہ خیال نہیں کیا کہ آسمان وزمین بند تھے پھر ہم نے انھیں کھولا۔

اس آیت کی ایک تفسیر تو یہ ہے کہ زمین وآسمان دونوں ملے ہوئے تھے پھر اللہ نے ان کو جدا کر دیا۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت کریمہ کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے ارشاد فرمایا: آسمان کا رتق یہ تھا کہ وہ بارش نہیں برساتا تھا اور زمین کا رتق یہ تھا کہ اس سے سبزے اور پودے نہیں اگتے تھے پھر اللہ نے اس میں فتق پیدا کر دیا۔ تو آسمان کا فتق یہ ہے کہ وہ بارش برسانے لگا اور زمین سبزے اگانے لگی۔

کائنات کے بارے میں جدید ترین تصور یہی ہے کہ مختلف قرائن و مشاہدات کی بنیاد پر سائنس داں اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ کچھ ہزار سال پہلے کائنات کا مادہ جمود اور سکون کی حالت میں تھا۔ یہ ایک بہت ہی سخت، انتہائی گرم گیس تھی۔ تقریباً پچاس کھرب سال پہلے ایک زبردست دھماکے سے پھٹ پڑی لیکن قرآن پاک صراحتاً اس نظریہ کی تردید کرتا ہے کہ زمین وآسمان یہ کسی دھماکے کی پیداوار نہیں۔

آسمانوں کے نیچے یہ شمس وقمر کی لائٹنگ، ستاروں کی قندیلیں، گردش لیل ونہار، سورج کا تنہا سارے عالم کو منور کرنا پھر اس کا اپنے مستقر پر جاری رہنا، چاند کا اپنی منزلوں کو طے کرنا، نہ چاند سورج کو پا سکے اور نہ سورج چاند کو پھر ان سب کا اپنی قدیم روش پر لوٹ آنا۔

زمین کے اوپر سمندروں اور نہروں کا ہونا اور استقرار زمین کے لیے پہاڑ کو میخ بنا کر اس میں نصب کر دینا۔ یہ سب کسی زبردست دھماکے کی پیداوار نہیں ہو سکتی، یہ محض ان کی فہم کی کمی، اور فہم و ادراک سے عاری ہونے کی دلیل ہے بلکہ اس سے تو صنعت باری اور اس کی کارسازیوں کا انکار لازم آتا ہے۔

پیدائش ارض وسماں کے بارے میں رب کا ارشاد ہے اِنَّ رَبَّکُمُ اللّٰهُ الَّذِیۡ خَلَقَ

السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ بے شک تمھارا رب وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا۔

قرآن مجید نے ہائیڈروجن اور آکسیجن کو آج سے چودہ سو سال پہلے زندگی کے لیے لازم قرار دیا جیسا کہ ارشاد ہے: وَ جَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ اَفَلَا يُؤْمِنُوْنَ (سورۃ الانبیاء، آیت:۲۰) اور تمام جاندار چیزیں ہم نے پانی سے بنائی پھر یہ لوگ ایمان کیوں نہیں لاتے۔

قرآن مجید نے آج سے چودہ سو سال پہلے کھلے لفظوں میں مسلمانوں کو نظام شمسی کی طرف متوجہ کیا۔ اَلشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ سورج اور چاند ایک حساب مقرر سے چل رہے ہیں۔

علم جنینیات کے تعلق سے

معروف فرنچ فزیشین اور سائنس داں موریس بوکاے نے ۱۹۷۶ء میں یہ بات کی تھی کہ قرآن مجید حدیث نبوی ﷺ اور جدید سائنس کے درمیان مکمل ہم آہنگی ہے۔

ماہر جنینیات (Embryologists) دریاے حیرت میں غرق ہیں کہ وہ کتاب ،قرآن مجید جو چودہ سو سال پہلے حضرت محمد مصطفے ﷺ پر نازل ہوئی اس میں اور آپ ﷺ کی حدیث میں جنین کی افزائش کے مراحل کی معلومات درج ہیں۔

Embryologists will be surprised to find in the quranic text, revealed to Prophet Muhammad (Peace be upon him) 1400 years ago, and in his hadith information on the slogs of development of the embryo.

ترجمہ: ماہر جنینیات قرآن کے متن میں جو کہ محمد ﷺ پر چودہ سو سال پہلے نازل ہوا تھا، اور ان کی احادیث میں جنین کے ارتقا کے مراحل کی معلومات پر متعجّب ہیں۔

مضامین

اداریہ (مجلہ: کاروانِ رئیس القلم)

قلبی واردات

محمد رضا قادری مصباحی
پرنسپل: جامعہ حضرت نظام الدین اولیا
مرقومہ: جون ر ۲۰۱۲ء

جامعہ حضرت نظام الدین اولیا، ذاکر نگر، نئی دہلی، جس کا قیام ایک قلندر صفت، مردِ درویش کے ذریعہ ۱۹۹۲ء میں عمل میں آیا تھا آج وہ ایک تنہ آور درخت بن چکا ہے، جس کے ثمرات سے ہند و بیرون ہند کے مسلمان فیض یاب ہو رہے ہیں۔ کیا ضرورت تھی اس ادارہ کے قیام کی؟ جب کہ اہلسنت کے پاس ہزاروں کی تعداد میں اس سے بڑے دینی ادارے موجود تھے۔ ہاں! ایک سبب تھا جس نے اس مردِ آہن کو جسے دنیا قائد اہل سنت، رئیس القلم علامہ ارشد القادری (ولادت ۱۹۲۴ء وفات ۲۰۰۲ء) کے نام سے جانتی ہے، اس ادارہ کے قیام پر مجبور کر دیا۔ وہ داعیہ یہ تھا کہ قائد اہلسنت جو بالیقین، قائد عالمِ اسلام تھے وہ آج کو نہیں آج سے پچاس، سو سال آگے کو دیکھتے تھے۔ انھوں نے یورپ کی وادیوں سے اٹھنے والے اضطراب کی اس لہر کو محسوس کر لیا، کہ اہل مغرب کسی ایسے مذہب کی تلاش میں سرگرداں ہیں جو انھیں حقیقی سکون فراہم کر سکے۔ ان پر یہ حقیقت بہت پہلے منکشف ہو چکی تھی کہ یورپ و افریقہ اور امریکہ میں عیسائیت دم توڑ چکی ہے اور مشرق کے دوسرے مذاہب کے لوگوں کا بھی مذہب پر محض رسمی ایمان رہ گیا ہے اور درست بات یہ ہے کہ پچاس فیصد تعلیم یافتہ افراد مشرق کے ان خود ساختہ مذاہب سے بیزار ہیں؛ اس لیے کہ ان کے عقائد و مسلمات ان کے ذہنوں کو اپیل نہیں کرتے۔ لہذا جب انھیں کوئی نجات دہندہ مذہب نظر نہیں آیا تو ان کے قدم الحاد کی طرف بڑھنے لگے، اور لادینیت کا ایک دور شروع ہو گیا اور اکیسویں صدی کے آتے آتے یہ لادینیت خود ایک بڑے طبقے کا مذہب بن گئی۔ اب ضروری تھا کہ فوراً اس الحاد کے سیلاب کو روکا جائے اور لوگوں کو مذہب کی طرف واپسی کی دعوت دی جائے۔ لیکن یہ کام اتنا

آسان نہ تھا، بلکہ اس کے لیے طویل المدت منصوبہ بندی، ٹھوس لائحۂ عمل اور ایک مشنری نظام کی ضرورت تھی اور اتنا بڑا کام کسی روایتی مدرسہ کے ذریعے انجام نہیں پاسکتا تھا، اس کے لیے الگ سے ایک تربیتی مرکز قائم کرنے کی ضرورت تھی، جہاں داعی کو مدعو قوموں کی زبان، ان کی تہذیب، ان کے مذہب، ان کے افکار وخیالات اور ترجیحات سے مکمل طور پر روشناس کرایا جاسکے، تاکہ یہ مبلغین غیر مسلم آبادیوں میں پہنچ کر وہاں کی مقامی زبان میں اسلام کی دعوت اور اس کا صحیح تعارف پیش کرسکیں۔

قائد اہلسنت کی نگاہِ دوربین نے دیکھ لیا تھا کہ اسلام اکیسویں صدی میں ایک غالب مذہب کی شکل میں دنیا کے نقشے پر ابھر کر سامنے آرہا ہے۔ لوگ بکثرت اسلام میں داخل ہورہے ہیں۔ سکون وآشتی کی متلاشی روحوں کا مداوا صرف اسلام کرسکتا ہے اور اسی کے پاس وہ جوہر حیات ہے جس کو پانے کے لیے آج کی انسانیت مضطرب ہے۔

راقم سطور کی نگاہ میں اس عہد کا سب سے بڑا کام یہ ہے کہ اسلام کو ایک فطری مذہب کے طور پر قابلِ تفہیم بناکر دنیا کے سامنے پیش کیا جائے۔ اور یہی بانیِ ادارہ کا مقصد بھی تھا۔ اس حقیقت کے اعتراف کرنے میں راقمِ سطور کو تامل نہیں کہ جن خطوط پر ادارہ کا قیام عمل میں آیا تھا ابھی وہاں تک پہنچنے میں اسے مکمل کامیابی نہیں مل سکی ہے۔ اگر علامہ کی زندگی وفا کرتی اور کم از کم دس سال وہ اور زندہ رہتے تو جماعت پچاس سال کا فاصلہ طے کرلیتی اور وہ مشن بھی پورا ہوجاتا۔ تاہم اس سمت میں قدم ڈالنے کے لیے جامعہ نے وہ زمین فراہم کردی ہے جس پر چل کر آج بھی دعوتِ اسلام کا ہمہ گیر انقلاب برپا کیا جاسکتا ہے۔

جامعہ نے جماعت اہل سنت کی بروقت فکری رہنمائی کی ہے اور دینی مدارس کے پروردہ علما کو عصری جامعات تک پہنچنے کا راستہ دکھایا ہے۔ ان کی صلاحیتوں کو دوسالہ تربیتی کورس کے ذریعہ نکھار کر اس قابل بنایا کہ وہ ان عصری درسگاہوں سے بھی خوشہ چینی کرسکیں۔ آج دہلی اور جامعہ ازہر مصر میں سینکڑوں کی تعداد میں اہلسنت کے جو طلبہ اعلی تعلیم میں منہمک ہیں وہ جامعہ کی دین ہیں۔

گزشتہ پانچ سالوں سے ادارہ، تعلیمی سال کے اختتام پر ایک علمی وفکری مجلّہ شائع کرتا چلا آیا ہے جو یہاں کے ہونہار طلبہ اور قابل اساتذہ کے علاوہ دیگر اہل قلم کے مضامین پر مشتمل ہوتا ہے۔ امسال کا سالانہ مجلّہ ''کاروانِ رئیس القلم'' حجۃ الاسلام امام ابوحامد محمد غزالی علیہ الرحمہ کی حیات وخدمات اور افکار کے تعارف پر مشتمل ہے۔

ہجری کلینڈر کے حساب سے ۱۴۰۵ھ میں ان کی وفات کو جب نو سو سال مکمل ہوئے تھے تو پوری دنیا میں جشنِ غزالی منایا گیا تھا۔عالمی سطح پر سمینار کیے گئے۔کتابیں شائع کی گئیں۔ سال گزشتہ ۲۰۱۱ء میں عیسوی کلینڈر کے حساب سے ان کی وفات کو نو سو سال مکمل ہوئے ہیں۔ اس موقع پر بھی ان کو یاد کیا گیا۔ اور سمینار و کانفرنسز منعقد ہوئیں۔ ممتاز عصری اداروں نے غزالی کی شخصیت و کارنامے پر سمینار کیے اور اس طرح ان کو خراج عقیدت پیش کیا گیا۔

امام غزالی، بلاشبہ دنیاے تصوف کے وہ قافلہ سالار ہیں جن کے ذکر کے بغیر تصوف کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔ یوں تو غزالی اپنے وقت کے مروجہ علوم وفنون کے غواص تھے، لیکن ان کو شہرتِ دوام تصوف کے ذریعہ ملی۔ اخیر عمر میں تصوف ہی ان کا اوڑھنا اور بچھونا بن گیا۔

امام غزالی کی داستان حیات کی ورق گردانی انسان کو عجیب حیرت میں ڈال دیتی ہے، ابتداے عہد میں وہ ایک دنیادار، جاہ پسند اور روایتی عالم نظر آتے ہیں، پھر ۱۰؍سالہ عرصہ ریب وتشکیک میں گزرتا ہے جس میں تلاش حقیقت کی راہ میں وہ سرگرداں دکھائی دیتے ہیں، فقہ و کلام اور فلسفے کا عمیق مطالعہ کرتے۔ جب ان پر یہ واضح ہوجاتا ہے کہ موصل الی اللہ ان میں سے کوئی بھی نہیں تب تصوف کی طرف مائل ہوتے ہیں اور مختلف روحانی تجربات کے ذریعہ ان پر منکشف ہوتا ہے کہ تصوف ہی حق تک پہنچانے والا راستہ ہے۔ پھر اسی کے اسیر ہوکر رہ جاتے ہیں۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ آج دنیا وہابی ازم سے بیزار ہے، وہ صوفی اسلام اور صوفیہ سے قریب آرہی ہے۔

امام غزالی پر مشرق و مغرب خصوصًا عرب دنیا میں بہت زیادہ کام ہوا ہے اور مختلف

انداز میں لوگوں نے کام کیا ہے۔ البتہ برصغیر ہند میں غزالی پر کام کی رفتار سست رہی۔

غزالیات کے حوالے سے سب سے پہلا کام سید محمد مرتضٰی زَبیدی بلگرامی ،صاحب تاج العروس (وفات ۱۲۵۰ھ) کا ہے انھوں نے ''اِتحاف السادۃ المتّقین'' کے نام سے کئی ضخیم جلدوں میں احیاء العلوم کی شرح لکھی اور فکر غزالی کو جدید انداز میں پیش کیا۔ دوسرا نام مولانا شبلی نعمانی کا ہے انھوں نے ''الغزالی'' نام کی کتاب لکھ کر پہلی بار اردو قارئین تک امام غزالی کو تمام تر تفصیلات کے ساتھ پیش کیا ہے۔ یہ کتاب ۲۶۵ر صفحات پر مشتمل ہے، جس کو دار المصنفین، شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ نے شائع کیا ہے۔ اس کتاب میں ان کی شخصیت اور فن کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہندوستان میں اردو قارئین کے لیے یہ کتاب ماخذ کا درجہ رکھتی ہے۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی نے بھی تاریخ دعوت و عزیمت میں اس کتاب کو اپنا ماخذ بنایا ہے۔

البتہ عقائد کے باب میں اس کتاب کے بعض مندرجات سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا۔ اس پر از سر نو تحقیق کی ضرورت ہے۔

خانقاہ عارفیہ سید سراواں (الہ آباد) مبارک باد کی مستحق ہے کہ اس طویل خموشی کو توڑتے ہوئے اس نے تصوف اور صوفیہ کو پہلی بار نئے رنگ و آہنگ کے ساتھ پیش کرنے کی سعادت حاصل کی ہے۔ ۲۰۱۰ء امام غزالی کی شخصیت کو بھی اس نے موضوع مطالعہ بنایا اور اس پر خصوصی شمارہ شائع کیا۔ ۲۰۱۲ء میں افکار غزالی کی تفہیم پر یک روزہ سمینار کیا۔

۲۰۱۱ء میں ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام جامعہ ملیہ اسلامیہ کے میر حسن میر حال میں پروفیسر اختر الواسع صاحب، صدر شعبۂ اسلامیات جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کی سربراہی میں ایک کامیاب سمینار منعقد ہوا۔

البتہ یہ سعادت قسّامِ ازل نے جامعہ حضرت نظام الدین اولیا کے حصہ میں لکھ دیا تھا کہ اس کے ارباب حلّ و عقد نے افکار غزالی سے اسلامیان برصغیر کو روشناس کرنے کے لیے ایک ضخیم نمبر شائع کرنے کا فیصلہ کرلیا اور اب یہ نمبر آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ کاروان کے

مشمولات کو درج ذیل سات ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے:(۱)منظومات (۲)شخص و عکس (۳)خدمات واثرات (۴)لوح وقلم (۵)فکر ونظر (۶)مذاکرہ (۷)مکتوبات۔

تمام مشمولات کو خوب سے خوب تر بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ شخص وعکس کے کالم میں پروفیسر اخترالواسع صاحب کا مضمون انتہائی فکر انگیز ہے، مختصر ہونے کے باوجود غزالی کی شخصیت وفکر کا احاطہ کرنے میں کامیاب ہے۔

خدمات و اثرات کے باب میں حضرت مولانا یٰسین اختر مصباحی، حضرت مولانا عبدالمبین نعمانی اور مولانا عرفان ازہری کے مقالات لائق مطالعہ اور بصیرت افروز ہیں۔

اس بار کاروان کے شمارہ میں پہلی بار محترم پروفیسر فاروق احمد صدیقی اور مولانا طفیل احمد مصباحی وارد ہوئے ہیں، ہم ان کا صمیم قلب سے خیر مقدم کرتے ہیں۔ پروفیسر صاحب نے عدیم الفرصتی کے باوجود مکاشفۃ القلوب کے حوالے سے طویل مقالہ سپرد قرطاس فرمایا ہے اور پہلی بار اس کے حقائق و معارف کو مضمون کی شکل میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کی ہے۔

فکر ونظر کے کالم میں پانچ قیمتی مقالات موصول ہوئے۔ مولانا ذیشان احمد مصباحی نے امام غزالی کے فکری نظام کو عصری انداز میں پیش کرنے کی خوب تر کوشش کی ہے۔ اپنے مواد و پیش کش کے اعتبار سے یہ انتہائی علمی اور فکری مقالہ ہے۔ مولانا مقبول احمد سالک مصباحی نے اچھوتے موضوع کا انتخاب کرکے بہت بڑی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کی ہے۔ پروفیسر حمید نسیم رفیع آبادی، صدر شعبۂ دینیات کشمیر یونیورسٹی، سری نگر اور پروفیسر سید ضیاء الدین شمسی طہرانی، ٹونک کے ہم بے حد مشکور ہیں کہ ان دونوں حضرات نے اپنے موضوع پر نہایت ہی تحقیقی وتنقیدی مقالات پیش کیے ہیں، جو یقیناً لائق مطالعہ ہیں۔ پروفیسر ضیاء الدین کاظمی نے راقم سطور کے اصرار پر سفر و حضر میں اس مقالے کو قلمبند فرمایا اور بروقت عنایت کردیا۔

راقم سطور کا خیال ہے کہ ''امام غزالی ڈاکٹر اقبال کی نظر میں'' اس موضوع پر ابھی تک کسی

نے خامہ فرسائی نہیں کی تھی۔

گرامی قدر مولانا اشرف الکوثر مصباحی نے گوناگوں مصروفیات کے باوجود اپنا فکری مضمون قلمبند فرمایا، ان کا یہ مضمون عصر حاضر کے نام نہاد متصوفین کے لیے تازیانۂ عبرت اور علما کے لیے سبق آموز ہے۔ انھوں نے امام غزالی کے عہد کے مسائل کا اکیسویں صدی کے مسائل سے موازنہ کیا ہے اور اس بات پر زور دیا ہے کہ فکر غزالی کی عصری معنویت آج دو چند ہوگئی ہے اور آج زمانہ کو پھر امام غزالی کی ضرورت ہے۔

بحث و نظر کے گوشہ میں مفتی محمد آفاق احمد مجددی، نقشبندی بانی: الجامعۃ الاحمدیہ، قنوج اور مولانا حکیم محمد یعقوب قادری، امام و خطیب مسجد خلیل اللہ بٹلہ ہاؤس کی تحریریں طلبہ، علما اور عوام سب کے لیے یکساں مفید اور عبرت آموز ہیں۔ صاحبزادۂ قائد اہلسنت حضرت مولانا فیض ربانی، قادری نائب، صدر جامعہ ہذا کے ذکر کے بغیر یہ باب مکمل نہیں ہوسکتا کہ انھیں کی تحریک اور پیہم اصرار نے راقم سطور کو اس نمبر کی تیاری کے لیے آمادہ کیا، ان کی حوصلہ افزائی نے ہر موڑ پر استحکام بخشا۔ ادارہ ہذا کے جملہ اساتذہ، طلبہ اور معاونین اور مخلصین قابل مبارکباد اور مستحق تشکر ہیں کہ ان کی مسلسل محنتوں سے یہ خصوصی شمارہ شائع ہوکر زیب نگاہ ہورہا ہے۔

عزیز القدر نور الدین نظامی، حسنین رضا نظامی، محمد ادریس، محمد شمس الدین اور محمد فہیم احمد سلمہم اللہ تعالی (طلبۂ جامعہ) نے بڑی جانفشانی کے ساتھ مضامین کمپوز کیے۔ اللہ تعالی ان کو بہتر جزا عطا فرمائے اور عالم باعمل بنائے۔

المختصر اس کام کی نزاکت اور اس راہ کی دشواری دوسروں کے لیے عسیر الفہم ہے۔

ذوق ایں مے نہ شناسی بہ خدا تانہ چشی

وہ تمام اہل قلم جن کو دعوتِ تحریر دی گئی تھی ان میں سے نصف لوگوں کے مقالات و مضامین موصول نہ ہوسکے۔ اگر طے شدہ خاکہ کے مطابق وہ مضامین مل جاتے تو یقیناً اس شمارہ کی افادیت دوگنی ہوجاتی۔ ہمیں اس کا اعتراف ہے کہ بعض وجوہ کی بنیاد پر موضوعات کے اعتبار سے یہ خصوصی شمارہ اتنا معیاری نہ بن سکا جتنا کہ ہماری خواہش تھی۔ **السعي منا و الإتمام من الله تعالی۔**

محترم ڈاکٹر سید علیم اشرف جائسی کا مضمون شامل اشاعت ہونا تھا، لیکن ان کے طویل دورۂ

ماریشش کی وجہ سے ان کا مقالہ نہیں مل سکا۔ واپسی پر وہ صاحب فراش ہوگئے۔ اللہ تعالی انھیں صحت عطا فرمائے۔

تاہم اس خصوصی شمارہ نے غزالیات پر کام کرنے والے محققین کے لیے نئے نئے آفاق کھول دیے ہیں، اور فکر غزالی کی نئی سمتوں سے لوگوں کو روشناس کرایا ہے۔ یقیناً یہ ایک قابل قدر کوشش ہے اور احسان مندی بھی۔ ہم جملہ اہل قلم کے بے حد ممنون اور شکرگزار ہیں۔ اللہ تعالی ہم سب کی اس حقیر کاوش کو قبول فرمائے اور اس شمارہ میں قلماً، عملاً اور درہماً حصہ لینے والے تمام افراد کو اپنے فضل کے مطابق اجر جزیل عطا فرمائے۔

کتابوں اور اداروں

پر تاثرات و

تقدیمات

تقدیم، تذکرۂ شمس ولایت، حضرت چندا میاں، رامپور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حَامِداً وَمُصَلِّیاً وَمُسَلِّماً

اس وقت ہمارے پیش نظر "تذکرہ شمس ولایت حضور چندامیاں" ہے جو ۶۰/ صفحات پر مشتمل کتاب ہے اور اسے گرامیٔ قدر حضرت مولانا محمد اویس رضا صاحب نے ترتیب دیا ہے۔ مولانا اویس رضا نوجوان فاضل اور گونا گوں صلاحیتوں کے حامل، لکھنے پڑھنے کا ذوق رکھنے والے عالم دین ہیں، انھوں نے بڑی عرق ریزی کے ساتھ منتشر شہ پاروں اور یاد داشتوں کو قلم بند فرما کر حسین لڑی میں پرو دیا ہے اور کتاب کی زبان انتہائی سادہ وشستہ رکھنے کی کوشش کی ہے تاکہ ہر عام وخاص اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔

سلطان العارفین، مجذوبِ کامل، عارف باللہ حضرت سید شاہ چندا میاں رحمۃ اللہ علیہ (ولادت ۱۹۰۳ء تخمیناً وفات ۲۰۰۸ء) مطابق ۸/ رجب ۱۴۲۹ھ کا نام پاک میں نے پہلی بار غالبا ۲۰۱۱ء میں سنا جبکہ نئی دہلی کے ایک جلسہ میں صوفی شاہ محمد رضا قادری کے یہاں میری پہلی ملاقات آپ کے صاحبزادۂ عالی قدر، محب وکرم فرما حضرت سید شاہ محمد ارشد قادری دام فضلہ، سجادہ نشین خانقاہِ عالیہ قادریہ، ہرن کھیڑہ شریف سے ہوئی۔ خاندانی وجاہت چہرہ سے عیاں تھی۔ باتوں میں حلاوت، انداز میں وقار و تمکنت اور شانِ خودداری بتارہی تھی کہ یہ ضرور کسی قیمتی کان کا ہیرا ہیں، جس کے قدرداں یہاں نہیں ہیں۔ وہاں کچھ ایسے بھی لوگ تھے جن کو ان کا رکھ رکھاؤ، اندازِ گفتگو شاق گزررہا تھا۔ حضرت ارشد میاں نے اپنے والد گرامی اور اپنی خانقاہ کا مختصر تعارف کرایااور بات ختم ہوگئی۔ اس پہلی ملاقات کا کچھ ایسا اثر ہوا کہ میں ان سے قریب ہوا اور وہ مجھ سے بے حد قریب ہوگئے۔ رفتہ رفتہ تعلقات میں مزید استحکام آتا گیا۔ جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء نئی دہلی میں قیام کے دوران ایک بار انھوں نے صاحب تذکرہ کے عرس میں آنے کی دعوت دی۔ میں نے دعوت قبول کرلی ۷/رجب ۱۴۳۵ھ کو میری حاضری ہرن کھیڑہ شریف نزد بلاس پور، رامپور، ہوئی رات میں بیان بھی

ہوا۔صبح میں حضرت ارشد میاں نے مجھ سے فرمایا کہ آپ کو میرے والد ماجد حضور چندا میاں رحمۃ اللہ علیہ کے حالات زندگی جمع کرنے ہیں۔آپ ہی اس کتاب کو ترتیب دیں شدید اِصرار فرمایا، لیکن میری مصروفیات کچھ اس نوعیت کی تھیں کہ معذرت کے سوا کوئی چارہ نہ رہا ۔اس کام کے لیے زیادہ وقت درکار تھا، کیونکہ کسی سابقہ ماخذ کے نہ ہونے کے سبب ہر واقعہ کو راوی سے سن کر ہی لکھنا تھا میں نے تجویز پیش کی کہ اسی علاقہ کے کوئی معتمد عالمِ دین جو تحریری ذوق رکھتے ہوں اور حضرت کو جانتے بھی ہوں ان سے یہ کام لیا جاے۔ حضرت کی سوانح حیات کا ایک خاکہ بھی ان کو بنا کر دیا۔بروقت کسی موزوں آدمی کا انتظام نہ ہو سکا ،آخر اس تاریخی وعلمی کام کا قرعۂ فال ایک نوجوان فاضل، مخلص عالم دین ،گرامیٔ قدر حضرت مولانا محمد اویس رضا صاحب کے نام نکلا۔آپ اکبر پور، کان پور دیہات کے مشہور اور نوجوان عالم ہیں، جامعۃ الرضا بریلی شریف سے ۲۰۱۰ ءمیں فضیلت کی تکمیل کے بعد دہلی آگئے اور یہاں جامعہ ملیہ اسلامیہ سے گریجویشن اور ایم اے مکمل کیا ہے۔لکھنے پڑھنے کا ذوق رکھتے ہیں۔تنظیم دعوۃ المسلمین کے پلیٹ فارم سے مذہبی ومسلکی ودعوتی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

چوں کہ کتاب میں حضور چندا میاں سے اوپر کے بزرگوں کا تذکرہ نہیں آیا ہے جو آنا چاہیے ، اس لیے اختصار کے ساتھ چند بزرگوں کے حالات جو کتابوں میں دستیاب ہوے انھیں درج کر رہا ہوں۔یقیناً یہ حالات قارئین کے علم میں اضافے کا باعث ہوں گے۔

حضور چندامیاں:

حضور چندا میاں کے جو اَحوال ووقائع میرے علم میں آے ان سے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ وہ ایک درویش کامل، مرد حق آگاہ اور قلندر صفت بزرگ تھے۔حق گوئی، بے باکی، جرأت وبہادری اور شان استغناء میں دور دور تک معاصرین میں ان کی نظیر نہیں ملتی ہے۔وہ صاحب حال وجذب وتصریف وتمکین تھے، سیف زبان تھے جو کہ دیا وہ ہو کر رہا۔ آخری عمر میں جذب غالب رہتا تھا، مریدین کا خیال اور پریشان حالوں کی دستگیری فرمایا کرتے

تھے۔ خلق کثیر نے آپ سے فیض پایا، بکثرت کرامات کا ظہور بھی ہوا۔ سید ارشد میاں صاحب نے بتایا کہ میرا خاندان مدینہ شریف سے بغداد اور پھر وہاں سے ہندوستان میں نہٹور آکر آباد ہوا۔ نہٹور اس وقت ضلع بجنور یوپی میں ہے۔ پھر نہٹور سے مراد آباد، بریلی شریف پھر رامپور کے مختلف قریوں میں آباد ہوا۔

خاندانی حالات پر کوئی کتاب موجود نہیں ہے جس سے سب کی تفصیل معلوم ہو سکے۔ البتہ انوار العارفین (فارسی) ایک کتاب ہے جو غالباً ۱۸۶۰ء کے بعد تالیف کی گئی ہے۔ اس میں چند بزرگوں کے حالات درج ہیں۔ زبان فارسی، رسم الخط انتہائی ژولیدہ، طباعت کی قدامت کے سبب بہت سے مقامات پر حروف مٹ چکے ہیں یا دھندلے پڑجانے کے سبب سمجھ سے باہر ہیں۔ میرے سامنے انوار العارفین کا بہت ہی قدیم نسخہ ہے، جس میں مصنف کا نام، مطبع اور سن اشاعت والا صفحہ موجود نہیں ہے۔ اسی حوالے سے ذیل کی سطور میں کچھ حالات ملاحظہ کریں۔

حضرت شاہ بولاقی رحمۃ اللہ علیہ:

سید ارشد میاں صاحب کے بیان کے مطابق آپ حسنی حسینی سید، اولادِ حضور غوث الاعظم ،شیخ عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہ سے ہیں۔ مرادآباد کے مشہور بزرگوں میں سے ایک ہیں، ان کا مزار سول لائن چکر ملک، شہر مراد آباد میں مرجع خلائق ہے۔ کتاب انوار العارفین کے مطابق آپ کی پیدائش ۱۰۴۳ھ اور وفات ۲۷/ صفر بروز دوشنبہ بعد نماز فجر ۱۱۳۹ھ مطابق ۱۷۲۶ء میں ہوئی۔

انوار العارفین میں ہے " ولادت شریف دریک ہزار وچہل وسہ ہجری عمر شریف نو دو شش سال ،وفات شریف بعد نماز صبح دو شنبہ بست وہفتم صفر درسال یک ہزار ویک صدوسی ونہ ہجری در عہد محمد شاہ بادشاہ۔[1]

---

[1] انوار العارفین، ص:۶۲۱

ترجمہ: حضرت شاہ بولاقی کی ولادت ۱۰۴۳ھ اور وفات ۲۷/ صفر بروز دوشنبہ بعد نماز فجر ۱۱۳۹ھ میں ۹۶/ سال کی عمر میں بعہد محمد شاہ بادشاہ ہوئی۔

حضرت بولاقی رحمۃ اللہ علیہ قادری بزرگ ہیں اور مولانا رستم علی صاحب رامپوری جو ایک واسطہ سے حضرت شاہ العالمین سید شاہ ابو عبد اللہ عبد الرزاق قادری رحمۃ اللہ علیہ کے مرید ہیں ان کے خلیفہ حضرت شاہ حفیظ اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ ہیں۔

انوار العارفین میں ہے: ذکر شاہ بولاقی خلیفہ حفیظ اللہ مرید مولانا رستم علی صاحب رامپوری کہ بیک واسطہ مرید حضرت شاہ صاحب بود [1]

حضرت شاہ بولاقی بڑے باکمال بزرگ تھے۔آپ نے سخت مجاہدے اور ریاضتیں کیں۔ آپ کی تعلیم وتربیت کا انتظام بارگاہ رسالت مآب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ہوا۔ظاہری تعلیم بہت کم ہوئی۔انوار العارفین میں مذکور ہے کہ آپ کی تعلیم وتربیت کے لیے سرور کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور سرکار غوث الاعظم دستگیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حکم پر حضرت شاہ محمد باقررحمۃ اللہ علیہ بغداد سے ہندوستان تشریف لائے اور بولاقی شاہ کو ظاہری وباطنی نعمت سے سرفراز فرماکرپھر بغداد شریف واپس ہوگئے۔حضرت شاہ محمد باقر رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ پر آپ سلسلۂ قادریہ میں بیعت ہوئے اور انھیں سے اجازت وخلافت پائی۔ان کے بغداد واپس ہو جانے کے بعد حضرت شاہ لال محمد رحمۃ اللہ علیہ سے بھی اکتساب فیض کا سلسلہ جاری رہا۔

انوار العارفین میں ہے "محمد باقر بحکم سرور عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم وبموجب امر مبرم حضرت غوث الاعظم صرف برائے تلقین حضرت شاہ بولاقی از بغداد در ہند رونق افروز ونعمت ظاہر وباطن موافق ہر دوامر بحضرت شاہ بولاقی بخشیدہ۔مرغوب بغداد تشریف روند۔حاجی رفیع الدین خانصاحب در تذکرہ می نویسد شاہ بولاقی از کاملان وقت خود بود ودر ابتدا سیاحت بسیار کردہ

(۱)انوار العارفین،ص:۶۲۰

بود" (۱)

جب حضرت شاہ بولاقی رحمۃ اللہ علیہ کا وصال ہوگیا تو مقبرہ کے لیے جگہ کی تلاش شروع ہوئی جگہ کے انتخاب میں لوگوں کا اختلاف ہو تو حضرت شیخ شہباز رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت کے مرید خاص تھے انھوں نے فرمایا: ایک روز میں حضرت کے ہمراہ تھا حضرت بولاقی شہر مرادآبا کے مغربی جانب آبادی سے ذرا فاصلہ پر تشریف لے گئے جہاں دریاے گنگا کا کنارہ تھا وہاں ایک فقیر کا تکیہ تھا، اس فقیر نے جوں ہی حضرت کو دیکھا اپنا بوریہ بستر باندھا اورروانہ ہوگیا ، میں نے پوچھا کیا معاملہ ہے فقیر نے جواب دیا۔امانت بزرگی است تا ایں دم امین بو دم مکین آمد مکان گذاشتم یعنی امانت بڑی چیز ہے مکین کے مکان میں آنے تک میں اس کا امین تھا اب جب کہ مکین آچکے ہیں تو میں جا رہاں ہوں۔ (۲)

حضرت بولاقی شاہ اپنی زندگی میں اکثر اس جگہ تشریف لے جاتے اور اس جگہ کی وسعت ،آب وہوا اور دلکشی کی تعریف کرتے۔اسی پر فضا مقام پر آپ کی تدفین عمل میں آئی۔

شاہ حافظ محمد امین قادری:

حضرت شاہ بولاقی کے جانشین ومرید حضرت حافظ محمد امین رحمۃ اللہ علیہ ہوے۔انھوں نے قصبہ "نہٹور"ضلع بجنور کو اپنامسکن بنایا ، ان کا وصال ۹/ربیع الاول ۱۲۰۱ھ میں ہوا۔تاریخ وصال رضی اللہ عنہ ہے(۱۲۰۱ھ)۔نہٹور میں ہی آپ کا مزار شریف ہے۔

حضرت شاہ غلام احمد قادری:

حضرت شاہ حافظ محمد امین کے تیسرے صاحب زادے ،مرید اور جانشین حضرت شاہ غلام احمد رحمۃ اللہ علیہ ہوے بعد وصال آپ کو اپنے والد گرامی کا خرقہ پہنایا گیا اور مسند

(۱)مرجع سابق
(۲)مرجع سابق

سجادگی پر بٹھایا گیا۔ بلند ہمت، عالی مقام صاحب تصرف تھے، علم ظاہر کی تحصیل نہیں کی تھی ،لیکن ان کی گفتگو سے علم وہبی کا پتہ چلتا تھا۔ فصوص الحکم کی گتھیاں سلجھاتے تھے جو شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کی مایۂ ناز تصنیف ہے۔ حضرت شاہ بولاقی کے عرس میں مراد آباد تشریف لاتے تھے۔۱۲۳۶ھ میں آپ کا وصال ہوا اور نہٹور میں تدفین ہوئی۔آپ کی تاریخ وصال قطب جہاں ۱۲۳۶ھ خاستہ ہے۔

مجاہد آزادی حضرت شاہ غلام بولن قادری:

آپ حضرت شاہ کریم اللہ ابن شاہ رحمت اللہ ابن حضرت شاہ بولاقی رحمۃ اللہ کے صاحب زادے ہیں۔ سلسلۂ طریقت اپنے ماموں حضرت شاہ غلام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل کیا اور انھیں سے اجازت وخلافت ملی۔ آپ خوش اخلاق اور قرآن شریف پڑھے ہوئے تھے۔ بہت سے لوگوں نے ان سے فیض پایا۔ آپ کا لنگر خانہ دوست ودشمن سب کے لیے عام تھا۔ دوست ودشمن میں کوئی فرق نہیں کرتے تھے۔ چناں چہ غدر کے زمانہ میں جو ۱۸۵۷ءہے آپ کے لنگر خانہ میں دوست ودشمن سبھی آکر کھانا کھاتے اور چلے جاتے اور آپ کو کسی سے نہ کوئی حاجت تھی ، نہ کوئی کام۔ ان کی پیدائش قصبہ سوارہ شریف میں ہوئی اور سکونت بھی یہیں رہی۔ آپ ہر سال اپنے جد امجد حضرت بولاقی شاہ کے عرس میں مراد آبادتشریف لاتے تھے۔ صاحب انوار العارفین لکھتے ہیں: میں حضرت شاہ غلام بولن کی زیارت سے مشرف ہو چکا ہوں۔

انگریزوں نے اس جرم کی پاداش میں کہ آپ انگریز دشمن لوگوں کو خانقاہ میں کھانا فراہم کرتے ہیں ان کی خاطر ومدارت کرتے ہیں۔ جزیرۂ انڈمان میں قید کر دیا، جہاں بطل حریت استاذ مطلق حضرت علامہ فضل حق خیرآبادی رحمۃ اللہ علیہ جیسے اساطین امت کو جلا وطن کیا گیا تھا۔ حضرت غلام بولن کے حالات سے پتہ چلتا ہے کہ جنگ آزادی ہند میں آپ نے انگریزوں کے خلاف سرگرم رول ادا کیا تھا۔ مجاہدین آزادی کی مدد بھی فرماتے تھے اور ان کے لیے لنگر خانہ کا دروازہ بھی کھلا رکھتے تھے۔ صاحب انوار العارفین کے مطابق جزیرۂ انڈمان ہی

میں ۲؍ ربیع الاول ۱۲۷۶ھ مطابق ۱۸۶۰ء میں آپ کا وصال ہوا۔[1] ان کے حال پر یہ شعر صادق آتا ہے۔

خون نکردہ ایم وکسے رانکشتہ ایم   جرہم ہمیں کہ عاشق روے توگشتہ ایم

آپ کے صاحب زادے حضرت محمد عاشق ہوے جو پوری زندگی اپنے پدر بزرگوار کے نقش قدم پر چلتے رہے۔ خوب صورت وخوب سیرت تھے، یہاں تک کے حالات انوار العارفین کے سہارے قلم بند کر دیے گیے تاکہ صاحب تذکرہ کے خاندانی پس منظر پر ہلکی سی روشنی پڑ جاے۔

حضرت ارشد میاں صاحب نے کتاب کی تصحیح اور مقدمہ لکھنے کی ذمہ داری میرے سر ڈال کر بڑی آزمائشوں میں ڈال دیا، ایسے موضوع پر قلم کو جنبش دیناجس پر پہلے سے کچھ نہ لکھا گیا ہو میرے بس کی بات نہیں تھی۔ میں اسے حضور چندا میاں اور ان کے بزرگوں کی کرامت اور فیضان سمجھتا ہوں کہ انھوں نے مجھے سے یہ کام لے لیا اور بہت سے حالات کو میرے قلب پر منکشف فرما دیا۔ مولانا ظفر الدین برکاتی صاحب کی زبانی معلوم ہوا کہ ایک سال قبل رضا لائبریری رامپور سے حضرت بولاقی شاہ رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت پر کوئی مضمون شائع ہوا ہے جس میں حضرت چندا میاں کا بھی مختصر تذکرہ ہے۔ افسوس کہ یہ مضمون ہمیں دستیاب نہ ہو سکا۔ بعد کی اشاعت میں اس سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ حضرت سید ارشد میاں قادری صاحب قابل تحسین ولائق مبارک باد ہیں کہ جو کام اب تک ان کے خاندان کے کسی فرد نے نہیں کیا اس کام کو آپ سر انجام دے رہے ہیں اور اپنے بزرگوں کی تاریخ کو جمع کر کے بولاقی خاندان کی شاندار تاریخ رقم کر رہے ہیں۔ ارشد میاں ولادت (۷؍ اپریل ۱۹۷۹ء) وجیہ صورت، نیک طینت ، صاف گو اور بے باک انسان ہیں۔ طبیعت میں استغنا اور فقر درویشی انھیں ورثے میں ملی ہوئی ہے۔ والد گرامی نے آخر وقت میں انھیں کو اپنا جانشین

(۱) انوار العارفین، ص: ۶۲۳

بنایا اور اپنی دستار ان کے سر پر باندھی تھی۔

ابتدائی مذہبی تعلیم الجامعۃ القادریہ رچھا بریلی شریف میں ہوئی۔ ہائی اسکول کی تعلیم DAV انٹر کالج وشارت نگر تحصیل بلاس پور سے مکمل کی۔ اس کے بعد ممبئی چلے گئے اور وہاں محمد علی روڈ پہ پانی والے جہاز میں جنریٹر کی آپریٹنگ کی، وہاں سے دہلی ڈومیسٹک ایر پورٹ پر منتقل ہو گئے اور چار سال تک ٹرمنل A پر میگھا پرایئویٹ کمپنی میں ٹرانسپورٹ منیجر کے طور پر کام کیا۔ ایک بار ایسا ہوا کہ حضور چندا میں اپنے مریدوں کے ہمراہ ایر پورٹ پر پہنچ گئے اور سخت برہم ہو کر بولے آج سے تمھارے لیے غلامی بند۔ ان کی پٹلیاباندھو، ان کا یہاں کوئی نہیں ہے۔ حضرت کے حکم پر ۶۰۰۰۰ روپے کی ماہانہ نوکری کو خیرآباد کہہ کر والد گرامی کی خدمت میں آگئے۔ ذاکر نگر نئی دہلی میں شیخ عبد اللہ صدیقی کی صاحب زادی شبانہ بی سے آپ کا عقد نکاح ہوا، جن سے ایک صاحب زادی سیدہ آیت فاطمہ ہے۔

ارشد میاں صاحب کے بڑے بھائی سید مہربان علی جو ”ردر پور“ میں مقیم تھے تقریباً ۶۰ سال کی عمر میں آج سے ایک سال قبل مسجد میں فجر کے وقت اللہ کو پیارے ہوگئے۔

دوسرے بڑے بھائی سید انصار میاں ہیں۔ آپ بہت ہی اچھے اور پکے حافظ قرآن ہیں جامعہ نعیمیہ مرادآباد سے ابتدائی عربی وفارسی کی تعلیم حاصل کی ہے۔ تقریباً ۵۰ سال سے قرآن کی تلاوت کر رہے ہیں بہت سے گاؤں میں آپ نے امامت کے فرائض انجام دیے ہیں۔ یہ اپنے والد بزرگوار ہی کی طرح مجذوب صفت، مغلوب الحال مرد درویش ہیں۔ دو بیگھہ زمین میں اپنا باغ لگا رکھا ہے جس میں ہر طرح کی فصلیں اور پھل پھول اگتے ہیں اور یہی ان کی دل چسپی کا سامان ہے۔ ان دنوں آپ پر جذبی کیفیت کا غلبہ رہتا ہے جو زبان سے نکل جاتا ہے وہ پورہ ہو کر رہتا ہے۔ آپ اپنے والد گرامی سے بیعت ہیں اور خلق خدا کو فیضیاب کر رہے ہیں۔ یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ سید اولاد رسول دو بھائی تھے۔ بڑے بھائی کا نام سید امّن میاں ہے یہ بون پورہ شریف میں ہی مقیم رہے اور دوسرے چندا میاں سید اولاد رسول ہوئے آپ ہرن کھیڑا شریف آگئے۔ ایک بہن سیدہ غفور بی باحیات ہیں۔

امید ہے کہ یہ کتاب بعد میں اس خاندان کے بزرگوں پر تحقیقی کام کرنے والے محققین ومصنفین کے لیے چراغ راہ کا کام دے گی اور حضور چندا میاں کی زندگی کے بہت سے مخفی گوشے سامنے آئیں گے اور وابستگان حضور چندا میاں کے لیے باعث تسکن دل وجان ثابت ہوگی۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کا بے پناہ شکر ہے کہ اس نے ہمیں یہ چند ٹوٹے پھوٹے جملے اپنے بزرگوں کی بارگاہ میں پیش کرنے کی توفیق مرحمت فرمائی۔

فقیر قادری محمد رضا مصباحی (کپٹول، نیپال)

استاذ: الجامعۃ الاشرفیہ، مبارک پور، اعظم گڑھ (یوپی)

وسابق پرنسپل: جامعہ حضرت نظام الدین اولیا

ذاکر نگر، نئی دہلی

۲۷/مارچ ۲۰۱۶ء بروز یکشنبہ

۱۶/جمادی الآخرہ ۱۴۳۷ھ

تقدیم، انوار طبیب ملت

سلسلۂ قادریہ، آبادانیہ، تیغیہ، یوسفیہ اور طبیب ملت قدس سرہ

پیکر علم وعمل حضرت مولانا مفتی محمد رضا مصباحی
استاذ: جامعہ اشرفیہ، مبارک پور، اعظم گڑھ

تیسری صدی قبل مسیح میں تہذیب و تمدن اور علوم وفنون میں غیر معمولی ترقی کے سبب ایشیا کا دماغ کہلانے والی مردم خیز ریاست مگدھ (بہار) کے شمال میں واقع شہر مظفر پور جو ۱۷۷۰ء میں ایک قصبہ کے طور پر معرض وجود میں آیا۔(۱) آج تجارتی، صنعتی اور علمی اعتبار سے ایک مرکزی مقام کی حیثیت سے اکنافِ ہند میں اپنی انفرادی شناخت رکھتا ہے۔ اس مردم خیز خطہ نے بڑے بڑے نامور، باکمال، اصحابِ علم و فضل اور اربابِ تصوف و طریقت پیدا کیے۔ قادری مجددی سلسلہ کے آبادانی، فریدی شاخ کو اس علاقہ میں بڑا فروغ حاصل ہوا۔ بارہویں صدی ہجری کے نصفِ ثانی میں سیالکوٹ، پنجاب سے ظاہر ہونے والے آبادانی سلسلے کو پھولنے، پھلنے کے لیے بہار کی زمین بڑی راس آئی۔ اس کے عالی ہمت خلفا کے ذریعہ یہ سلسلہ نہ صرف ہندوستان، بلکہ پاکستان، بنگلہ دیش اور نیپال تک پہونچا اور اس کو عام و تام کرنے میں تیغیہ شاخ کے مشائخ نے انقلابی رول ادا کیا۔

بانئ سلسلہ آبادانیہ، قطب العارفین، حضرت صوفی شاہ آبادانی صدیقی، سیالکوٹی ثم دہلوی کی ولادت، سیالکوٹ، پنجاب میں ۱۱۵۱ھ کو ہوئی۔ والد گرامی کا نام میاں شیخ نور جمال تھا۔ سلسلۂ نسب حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ تک پہونچتا ہے۔(۲) ان کو ان کے شیخ مولانا محمد زکریا لاہوری ثم دہلوی سے خرقۂ خلافت حاصل تھی۔ شاہ عالم ثانی مغل بادشاہ، حضرت قطب العارفین کا مرید تھا۔ اکثر ان کی بارگاہ میں نیازمندانہ حاضر ہوتا۔ ان کا سلسلہ

(۱) سوانح رفاقتی۔ مفتی محمود احمد رفاقتی، مظفر پوری۔
(۲) تذکرہ مشائخ عظام۔ ڈاکٹر محمد عاصم اعظمی، ص۴۴۹۔ المجمع الاسلامی، مبارکپور

اوپر کی طرف ساتویں کڑی میں حضرت مجدد الف ثانی، شیخ احمد فاروقی سرہندی (۹۷۱ھ-۱۰۳۴ھ) سے مل جاتا ہے اور حضرت شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کا سلسلۂ قادریہ شاہ سکندریہ کیتھلی کے واسطہ سے ۱۳؍ویں کڑی میں سیدنا حضور غوث پاک شیخ عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہ (۴۷۰ھ-۵۶۱ھ) سے جاملتا ہے اور شیخ کمال کیتھلی قدس سرہ (م۹۸۱ھ-۱۵۷۳ء) کے ذریعہ ۲۵ واسطوں سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تک پہونچتا ہے۔ چنانچہ خود مکتوبات شریف میں تحریر فرماتے ہیں:

ارادت من بہ محمد رسول اللہ ﷺ بہ وسائط کثیرہ است۔ در طریقۂ نقشبندیہ بست و یک واسطہ در میان است و در طریقہ قادریہ بست و پنج و در طریقہ چشتیہ بست و ہفت۔[1]

صوفی شاہ آبادانی کے نیچے تیسری کڑی میں شیخ الطائفہ مولانا سید شاہ فرید الدین رحمۃ اللہ علیہ آتے ہیں، جن کا مزار محلہ گنج شہر آرہ میں ہے، ان کے بارہ مشہور خلفا ہوئے ہیں۔ خلیفۂ ششم حضرت مولانا شاہ سمیع احمد مونگیری قدس سرہ سے حضرت تیغ علی قدس سرہ کو بیعت و ارادت حاصل ہے اور خلیفۂ دوازدہم، صوفی شاہ حکیم سید جلال الدین جڑہوی رحمۃ اللہ علیہ سے اجازت و خلافت حاصل ہے۔ اسی نسبت سے آپ فریدی کہلاتے ہیں۔

بہار، یوپی، بنگال، بنگلہ دیش اور نیپال میں جن کے ذریعہ سلسلۂ آبادانیہ کی پرزور اشاعت ہوئی وہ ذات قدوۃ السالکین، زبدۃ العارفین، حضرت صوفی شاہ محمد تیغ علی قادری قدس سرہ کی ہے۔ ان کو بجا طور پر سلسلۂ آبادانیہ کا مجدد بھی کہا جاسکتا ہے۔ آپ صوبۂ بہار میں سلسلہ تیغیہ کے بانی اور سرخیل صوفیا ہیں۔ ۱۳۰۰ھ میں موضع "گوریا" ضلع مظفر پور میں پیدا ہوئے اور یکم ربیع الآخر ۱۳۷۸ھ میں واصل بحق ہوئے۔

حضرت سرکار سرکاہی کی نگاہ باطن نے ہزاروں دلوں میں روحانی انقلاب پیدا کردیا۔ آپ کے چشمۂ حیواں سے سیراب ہونے والے عارفین و کاملین میں شمار کیے گئے۔

(۱) مکتوبات شریف۔ دفتر سوم۔ مکتوب ۸۷۔

آپ کی بزرگی اور کرامت کا ہر خاص و عام معترف نظر آتے ہیں۔مسلم الثبوت اکابر علما اور شیوخ طریقت نے آپ پر اعتماد کیا۔ چنانچہ قائد اہلسنت علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ، (۱۹۲۵ء-۲۰۰۲ء) رقمطراز ہیں:

"آپ کے قدر دانوں کی صف میں صرف عوام ہی نہیں ،بلکہ وہ اہل علم خواص بھی ہیں جن کی دینی برتری، مذہبی پیشوائی اور دیانت و ثقاہت پر زمانہ اعتماد کرتا ہے۔مثال کے طور پر تاجدار اہلسنت، شہزادۂ اعلی حضرت، سرکار مفتیٔ اعظم ہند، امام المفسرین، حضرت علامہ صدر الافاضل شاہ حکیم محمد نعیم الدین مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ، فقیہ اعظم، صدر الشریعہ، مولانا شاہ حکیم ابوالعلا امجد علی صاحب قبلہ، مصنف بہار شریعت رحمۃ اللہ علیہ، محدث اعظم ہند، سید محمد کچھوچھوی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت ملک العلما، مولانا شاہ ظفر الدین، فاضل بہاری رحمۃ اللہ علیہ، بحر العلوم، حضرت مولانا شاہ عبدالحفیظ رحمۃ اللہ علیہ، مفتیٔ آگرہ، حضرت استاذ العلما، مولانا شاہ حافظ عبدالعزیز صاحب قبلہ مبارک پور،سلطان المناظرین، حضرت مولانا شاہ محمد رفاقت حسین صاحب قبلہ، دنیاے اسلام کے یہ سارے مشاہیر، حضرت شیخ المشائخ کی روحانی ولایت سے متاثر ہیں۔(۱)

قائد اہلسنت کا یہ مختصر تبصرہ سینکڑوں صفحات پر مشتمل، کشف و کرامات سے لبریز کتابوں پر بھاری ہے اور ان کے قرار واقعی مقام و مرتبہ کی طرف اشارہ کرنے کے لیے کافی ہے۔

سرکار چاند پور: حضرت شیخ المشائخ سرکار سرکانہی کے ۳۷ خلفا ہوئے اور ہر خلیفہ اپنی جگہ آفتاب رشد و ہدایت ثابت ہوئے۔ان کے خلفا میں ایک اہم نام سرکار چاند پور، غواص بحر حقیقت، حضرت یوسف شاہ تیغی قدس سرہ (۱۹۰۰ء-۱۹۹۲ء) کا ہے۔آپ کی ذات سے

---

(۱) سالنامہ روشنی، ویشالی، ۱۴۳۷ھ/۲۰۱۵ء۔ المعین فاؤنڈیشن، خانقاہ تیغیہ، یوسفیہ۔ یہ مضمون، قائد اہلسنت نے جام نور کلکتہ کے تیغی نمبر کے لیے لکھا تھا وہیں سے لیا گیا ہے۔

سلسلہ تیغیہ آبادانیہ کا فیضان بہت ہی زیادہ عام و تام ہوا۔ صاحب کشف و کرامت، جذب و حال اور تمکین و تصرف تھے۔ آپ کا طریق، جذب الخلائق کا تھا۔ جدھر سے گذر ہوتا، خلق آپ کی طرف کشاں کشاں چلی آتی۔ صحبت شیخ نے آپ کی روحانی دنیا میں انقلاب پیدا کردیا تھا۔ آپ دائم الذکر اور شاغل تھے۔ آپ کے حالات کا غائرانہ مطالعہ بتاتا ہے کہ آپ حبسِ دم کے بھی عامل تھے جو اکابر صوفیاے اسلام کا خاص عمل رہا ہے۔

طریقت میں راسخ قدم اور شریعت پر صاحب استقامت تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اکابر علما و مشائخ ہند نے آپ پر اعتماد ظاہر کیا اور ان سے بیعت و ارادت کو اپنے لیے وسیلۂ نجات سمجھا۔ حضور مفتیٔ اعظم ہند، حضور حافظ ملت، حضور مجاہد ملت، حضرت مظفر حسین کچھوچھوی اور مولانا کاظم علی عزیزی علیہم الرحمۃ و الرضوان جیسے مشائخ عصر آپ کی جلالت شان اور علوّ ہمت کے معترف نظر آتے ہیں۔ مولانا احمد رضا صابری نے اپنے مضمون ''ڈھونڈاتھا آسماں نے جنھیں خاک چھان کے'' میں آپ کے ۳۶ خلفا کا تذکرہ کیا ہے۔ ان میں اول خلیفہ حضرت طبیب ملت کے برادر اکبر حضرت مولانا شاہ محمد الیاس قادری تیغی قدس سرہ ہیں ،جب کہ ۳۱ رویں مقام پر حضرت طبیب ملت، مولانا شاہ حافظ محمد اخلاق احمد تیغی قدس سرہ کا ذکر کیا ہے۔

حضرت طبیب ملت:

طبیب ملت، محبوب المشائخ، حضرت صوفی شاہ اخلاق احمد نوری، تیغی، یوسفی (۱۹۵۲ء-۲۰۰۵ء/۱۴۲۶ھ) شمالی بہار کے ضلع سیتامڑھی کی ایک مردم خیز بستی ''کھرساہا'' میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۶۸ء میں دار العلوم علیمیہ دامودر پور، مظفر پور سے حفظ قرآن کی تکمیل کی۔ درس نظامی میں مولویت تک کی تعلیم حاصل کی تھی کہ حالات ناسازگار ہوگئے اور کسب معاش کی طرف متوجہ ہوئے، لیکن طلب علم کا جذبہ کبھی بھی سرد نہ پڑا۔ آپ مسلسل اپنے زمانہ کے مشائخ اور علما سے اکتساب علم و فیض کرتے رہے اور ذاتی طور پر صوفیہ کے ملفوظات اور تصوف و طریقت کی کتابوں کا مطالعہ کرتے رہے۔ ۱۹۶۹ء میں بسڈیلہ ضلع بستی پہونچ کر حضور مفتیٔ اعظم ہند کے ہاتھوں پر سلسلۂ قادریہ رضویہ میں بیعت حاصل کی۔ مرشد کامل نے

روحانی توجہ ڈالی اور آپ کے اندر جذب وعشق کی چنگاری بھڑکادی ،لیکن سلوک کی تکمیل کسی اور بارگاہ سے مقدر تھی ۔پیر کامل کا باطنی اشارہ پاکر آپ سرکار چاند پور کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور سلوک و معرفت کے مدارج طے کیے ،تاآنکہ ۱۶رستمبر ۱۹۸۵ء مطابق ۲رربیع الاول ۱۴۰۶ھ کو شیخ طریقت شاہ محمد یوسف تیغی رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کو سلسلۂ قادریہ، مجددیہ، مجیبیہ، تیغیہ کی تحریری اجازت و خلافت عطا کی۔

طبیب ملت، اپنے عہد کی مُرتاض اور مرنجان مرنج شخصیت تھے، جن کے اَنفاس روحانی کی گرمی سے کتنے مردہ قلوب میں زندگی پیدا ہوئی۔وہ طبیب روحانی تھے اور معالج جسمانی بھی۔ان کی دعا اور تعویذ میں خاص اثر تھا۔ان کےصاحبزادہ ٔعالی قدر مولانا ارشد رضا قمر اخلاقی امجدی، استاذ جامعہ سعدیہ کیرلا نے انوار طبیب ملت میں ان کے تعلق سے جن احوال کا انکشاف کیا ہے وہ یقینا دیدۂ عبرت سے پڑھے جانے کے لائق ہیں۔کشف وکرامات کا اظہار بزرگی کے لیے ضروری نہیں تاہم غیر ارادی طور پر ان سے خوارق عادات کا ظہور من جانب اللہ ہوتا رہتا ہے، تاکہ ضعیف الاعتقاد لوگوں کو یقین کی دولت نصیب ہو۔حضرت طبیب ملت ایک صاحب حال، درویش صفت بزرگ اور صاحب کشف انسان تھے۔ہزاروں بندگان خدا نے ان سے فیض پایا۔بہار و نیپال کی بہت سی دیہاتوں اور تہذیب و ثقافت سے دور افتادہ علاقوں میں جاکر انھوں نے مخلصانہ طور پر تبلیغی فریضہ انجام دیا۔ان کی تحریری وقلمی نشانی "انوار تصوف" کے مطالعہ سے یہ عقدہ کھلتا ہے کہ آپ طریقت و معرفت اور حقیقت کے شناور اور اس بحر حقیقت کے غواص بھی تھے اور اس راہ کے فتنوں اور شیاطین کے مکائد سے پوری طرح باخبر تھے۔اسی لیے اس راہ کے سالکین و طالبین کی رہنمائی کے لیے آپ نے یہ اہم کتاب اپنے مرشد اجازت کے ایما پر تالیف فرمائی۔

گرامی قدر عزیزی مولانا محمد ارشد رضا قمر اخلاقی جو ابھرتی ہوئی نسل کے ایک صالح فکر، ذی استعداد اور نوجواں عالم ہیں ان کے شدید اصرار پر اپنی بے شمار مصروفیات کے سبب چند سطور بہت ہی عجلت میں سپرد قرطاس کرنے کی سعادت حاصل کی ہے۔اللہ اسے قبول فرمائے۔

محمد رضا قادری، مصباحی،خادم تدریس:جامعہ اشرفیہ، مبارکپور۔اعظم گڑھ۔

۲۴رجمادی الآخرہ ۱۴۳۸ھ / ۲۴رمارچ۲۰۱۷ء

تقریظ، مختار القراءت

مبسملًا و محمدًا و مصلیًا و مسلمًا

''مختار القراءت'' مؤلفہ فخرالقرا، حضرت حافظ قاری مولانا غلام رسول قادری ،اشرفی نیر غزالی بغرض تصحیح مطالعہ میں آئی، کثرت ہجوم کار اور قلّت وقت کے ماحول میں جہاں تک ممکن ہوسکا اس کا مطالعہ کیا، جہاں ضرورت محسوس ہوئی حذف واضافہ کر دیا گیا۔ یہ کتاب علم تجوید و وقف کا احاطہ کرتی ہے اور رسم قرآنی کے بعض مسائل کے ساتھ، تدوین قرآن اور رسم قرآنی کی پوری تاریخ پر مشتمل ہے۔ یہ طلبہ، علما، قرا اور اس فن کے شائقین کے لیے یکساں مفید اور قابل مطالعہ ہے۔ زبان کو سہل اور شستہ بنانے کی پوری کوشش کی گئی ہے تاکہ مبتدی طلبہ بھی استفادہ کر سکیں۔ معاصر تاریخ میں اہل بہار کی طرف سے بالخصوص اور پورے ہندوستان کے علما و قرّا کی طرف سے بالعموم مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں مزید علوم قرآن کی خدمات کی توفیقات سے نوازے اور اس کتاب کے فیض کو عام فرمائے۔

محمد رضا قادری مصباحی

الجامعہ الاشرفیہ، مبارک پور، اعظم گڑھ، یوپی

۱۶/ مارچ ۲۰۱۶ء بروز چہار شنبہ

تقریظ مصباح القرآت

الحمد لله الذی خلق الإنسان و علمه البیان و أمر فی کتابه بترتیل القرآن و الصلوۃ و السلام علی سید الأکوان الذی أنزل علیه الفرقان أما بعد!

زیر نظر کتاب مصباح القراءت مؤلفہ مجوّدِ عصر، فخر القرا، معمار امت مسلمہ، حضرت مولانا حافظ قاری غلام رسول نیر غزالی دام ظلہ العالی، لاک ڈاؤن کے زمانہ میں بغرض تصحیح و نظر ثانی مطالعہ میں آئی پوری کتاب از ابتدا تا انتہا مکمل پڑھا، خوب سے خوب تر پایا، اردو زبان کی قدیم فنی کتابوں سے کشید کرتے ہوئے کچھ جدت اور سہولت کے ساتھ یہ کتاب ترتیب دی گئی ہے۔ مشکل مصطلحات فن کو آسان بنادیا گیا ہے امید ہے کہ مبتدی طلبہ کے لیے یہ بہت مفید ہوگی۔

۲۰۱۶ء کی بات ہے کہ آپ کی پہلی شاہکار تصنیف ''مختار القراءت'' زیر مطالعہ آئی جو ۲۳۶ صفحات پر مشتمل ہے زیادات کو چھوڑ کر اس میں بہت تفصیل کے ساتھ روایت حفص کی تینوں فروع (علم تجوید، وقف اور رسم) پر گفتگو کی گئی ہے اس کتاب کی ضخامت اور طوالت کے پیش نظر ہم نے مصنف کو مشورہ دیا کہ اس کی تلخیص کرتے ہوئے ایک مختصر کتاب ترتیب دیں جس کا یاد کرنا طلبہ کے لیے آسان ہو آپ نے بسر و چشم مشورہ قبل کرتے ہوئے کام شروع کردیا، گاہے بگاہے مشاورت بھی ہوتی رہی اب یہ کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ میں صاحب کتاب کو اس خوبصورت تالیف پر ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں، ان کے جذبات اور احساسات، امت مسلمہ کے لیے کچھ کر گزرنے کا خیال، نسل نو کی تعمیر کے لیے منصوبہ بند کوششیں، فن تجوید و قراءت کو آگے بڑھانے کے لیے شبانہ روز تگ و دو ان کے معاصرین کے لیے لائق تقلید ہیں۔ کم وقت میں تعمیری، علمی اور فنی اعتبار سے آپ نے گراں قدر کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ خداوند متعال آپ کی عمر و صحت اور فضل میں برکتیں عطا فرمائے۔ اور آپ کی خدمات دینی کو قبول فرما کر مقبول انام بنائے۔ آمین بجاہ سید النبی الکریم علیہ الصلوۃ والتسلیم۔

خیر اندیش:

محمد رضا قادری مصباحی

خادم تدریس: الجامعۃ الاشرفیہ، مبارک پور، اعظم گڑھ (یوپی)

۲۰؍ رجب المرجب ۱۴۴۲ھ

۴؍ مارچ ۲۰۲۱ء، شب جمعہ مبارکہ

پیش لفظ، لمعات شیخ العالم

زیر نظر کتاب ''لمعات شیخ العالم'' مرتبہ عزیز القدر حضرت مولانا محمد صالح رضا مصباحی خیری مجددی، ساکن قاضی سعد اللہ پورہ، بنارس، متعلم درجۂ اختصاص فی الفقہ جامعہ اشرفیہ، مبارک پور و عزیز مکرم، محب گرامی قدر مولانا محمد حسن رضا خیری مجددی، ساکن، بسمل نگر، مہراج گنج، صاحبزادۂ حضور شیخ العالم حضرت مولانا محمد ابوالقیس مجددی خیری دام ظلہ العالی کے ایما پر باصرہ نواز ہوکر بصیرت افروز ہوئی۔ کتاب کے مضامین پڑھ کر روح کو فرحت حاصل ہوئی اور حضور شیخ العالم دامت برکاتہم العالیہ کے حوالے سے علم میں گراں قدر اضافہ ہوا۔

یہ کتاب موجودہ وقت میں ہندوستان میں سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ کے امام اور سب سے بڑے شیخ، عارف باللہ، قدوۃ السالکین، زبدۃ العارفین، شیخ العالم حضرت مولانا الحاج الشاہ احمد رضا خان النقشبندی المجددی الرضوی الخیری، صاحب سجادہ آستانہ عالیہ نقشبندیہ، مجددیہ خیریہ، کمال پور شریف ضلع مرزاپور یوپی، کی کتاب زندگی کے مختصر گوشوں کو واضح کرتی ہے۔ آپ کے مقام و مرتبہ، علو شان، روحانی کمالات، مجاہدات و ریاضات اور صوفیانہ خصلتوں سے قارئین کو متعارف کراتی ہے۔ یقیناً اس کا نقش ثانی نقش اول سے کامل و اکمل اور جامع ہوگا۔ مرتبین حالات کو کم وقت میں جن احوال و وقائع پر آگاہی ہوتی رہی ان کو قلمبند کر لیا اور جن پر نہیں ہوسکی ان کو چھوڑ دیا۔ یہی دیانت کا تقاضا ہے۔ اولیا اور صوفیہ کے تذکروں میں بکثرت بعد والوں نے الحاقات کر دیے۔ وجہ یہ ہوئی کہ تذکرے یا سوانح ان کی زندگی میں قلمبند نہیں ہوسکے۔ جس نے عقیدت میں جتنا چاہا غلو کر کے شامل کتاب کیا۔ لیکن یہ روش بہت ہی عمدہ ہے کہ صاحب تذکرہ کی زندگی میں ہی ان کی سوانح منظر عام پر آجائے تاکہ تمام واقعات و حالات کی تحقیق صاحب تذکرہ سے کرائی جاسکے۔ اس میں غلو یا رطب و یابس کی گنجائش ہی ختم ہوجاتی ہے۔ جس طرح ذخیرۂ احادیث میں ہمیں بکثرت موضوع روایات مل جاتی ہیں اسی طرح صوفیہ کے تذکروں میں موضوع کشف و کرامات کا غیر معمولی ذخیرہ تلاش کیا جاسکتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ واقعی حالات پر بھی یقین کرنا مشکل ہوجاتا ہے۔

الحمد للہ یہ تذکرہ پختہ شواہد اور سندوں کے ساتھ قارئین کے ہاتھوں میں پہنچ رہا ہے۔ اس لیے قارئین جو کچھ پڑھیں گے وہ حقیقت پر مبنی ہوگا۔ فقیر قادری کی سب سے پہلی ملاقات حضور شیخ العالم سے ذاکر نگر نئی دہلی کی سرزمین پر عبدالرحمٰن نقشبندی ابن عبدالستار قنوجی کے مکان پر ۱۰/ مارچ ۲۰۱۱ء کو ہوئی۔ حضرت کے رخ پرنور پر پہلی نظر پڑتے ہی محسوس ہوا کہ آج کسی اللہ والے سے میری ملاقات ہو رہی ہے۔ آپ کے ساتھ مولانا اسعد الخیری اور مولانا علی حسن خیری دام ظلھما اور دیگر خدام بھی تھے۔ حضور والا نے فقیر کی طرف باطنی توجہ فرمائی جس سے میں نے اپنے قلب میں حرارت روحانی محسوس کی۔ جس کے بعد مجھے یقین ہوگیا کہ یہ یقیناً شیخ محترم کا تصرف ہے۔ اسی وقت دل نے فیصلہ کیا کہ سلسلۂ نقشبندیہ کا فیض حاصل کرنے کے لیے مجھے آپ کی ذات سے طلب بیعت کرلینی چاہیے میں نے عرض مدعا کیا حضور نے مجھے طالب بیعت فرمالیا اور سینہ کھول کر لطائف کے مقامات کی نشان دہی فرمائی اور توجہ ڈالی۔ اس سے قبل میں تصوف کا صرف نام پڑھا کرتا تھا کتابوں میں عملاً تصوف سے میرا اشتغال نہیں تھا۔ اس ملاقات کی برکت سے سلسلۂ قادریہ کے ایسے شیخ سے میری ملاقات ہوئی جنھوں نے میرے دل کی دنیا میں انقلاب بپا کردیا اور میرے وجود کو روحانی اسلام کی لذت سے آشنا کیا وہ قدوۃ العارفین خواجہ محمد ظہیر عالم قادری برکاتی دامت برکاتہم العالیہ کی ذات گرامی ہے۔ ۲۰۱۱ء سے ۲۰۱۸ء تک حضور شیخ العالم سے میری کوئی ملاقات نہیں ہوسکی۔

۱۵/ اگست ۲۰۱۹ء کو نصیبہ بیدار ہوا اور دوبارہ حضور شیخ العالم کی زیارت کا شوق میرے دل میں انگڑائیاں لینے لگا اور میں بذریعہ کار مبارک پور سے چند احباب کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہوگیا۔ حضور نے الطاف کریمانہ سے بہرہ ور فرمایا۔

آپ کی ذات اس زمانے میں کبریت احمر کی مثل ہے۔ متقدمین صوفیہ کی روش پر گامزن ہے۔ طالبین و سالکین کی تربیت فرماکر مخلوق کی رہبری ان کے سپرد فرماتے ہیں۔ اب تک سینکڑوں لوگ آپ کی ذات سے واصل باللہ ہو چکے ہیں۔ آپ نے بڑے بڑے اصحاب کمال

پیدا کیے۔ جن میں بحر العرفان حضرت مفتی محمد آفاق احمد مجددی رحمہ اللہ کی شخصیت مثل آفتاب ہے۔ تصنع وریا کا گزر بھی آپ کے پاس نہیں ہوتا ہے۔ پڈرونہ، کشی نگر جیسے مقام پر ایک دور افتادہ دیہات میں ایک غریب انسان کے چھپر پوش مکان میں قیام رکھتے ہیں، جہاں لوگوں کے پہنچنے کے وسائل بھی محدود ہیں۔ عموماً پیران کرام ایسی جگہوں پر سکونت اختیار کرتے ہیں جہاں مریدین زیادہ آئیں، نذرانے جہاں زیادہ ملیں، شہرت وعزت جہاں زیادہ ہو لیکن آپ عظمتوں اور شہرتوں کی تمام بلندیوں سے بے نیاز ہوکر ایک خالص دیہات میں رہ کر یاد حق میں غریب مریدین کی حاجت روائی میں مشغول ہیں۔ اس زمانے میں ایسے پیر کا ملنا نہایت مشکل ہے۔ ایسے روشن ضمیر ہیں کہ بغیر کچھ کہے ہوئے مدعا سے باخبر ہوجاتے ہیں۔ پڈرونہ کے سفر میں ان کے ایک مرید باصفا حاجی علی رضا خیری کے گھر پر قیام رہا۔ ان کی زبانی حضور شیخ العالم کے بہت سے احوال پر مطلع ہوا ان کو ہم نے پایا کہ وہ مرشد کی محبت میں فنائیت کے مقام پر ہیں۔ یہ کتاب یقیناً سالکین راہ حق کو چراغ منزل کا کام دے گی۔ میں مرتبین کتاب کو دل کی گہرائیوں سے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

نظر ثانی کے دوران حتی الامکان املا کی غلطیوں کو نیز دیگر فروگزاشتوں کی تصحیح کردی گئی ہے۔ پھر بھی غلطی کا امکان بہر حال باقی ہے۔ حضور شیخ العالم کی شخصیت جس قدر عظیم ہے وہ اس بات کا تقاضہ کرتی ہے کہ آپ کی شخصیت پر تفصیلی موسوعی کتاب تیار کی جائے۔ کم ترک الاولون للآخرین کے بموجب ابھی بہت سے کام باقی ہیں۔

اللہ تعالیٰ اس کتاب کو مومنین ومتقین کے لیے سبب ہدایت بنادے اور اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے، مرتبین کو اجر جزیل عطا فرمائے۔

محمد رضا قادری مصباحی نقشبندی
خادم تدریس: الجامعۃ الاشرفیہ
مبارک پور، اعظم گڑھ، یوپی
شب ۱۵ ؍ رجب المرجب ۱۴۴۲ھ شب یکشنبہ

تاثرات، مدرسہ فیض النبی، نوری مرکزی دارالقراءت، لوہنہ، نیپال

مجود القراءة والتجويد في نيپال الحافظ القاري مولانا محمد نسيم القادري الثمري! تحية وسلاما

بسم الله الرحمن الرحيم إني تشرفت بالقدوم في مساء يوم الجمعة المؤرخة الأول من الربيع الآخر سنة ۱۴۳۳ھ الموافق ۱۸ من أذار سنة ۲۰۱۰م في مدرسة فيض النبي نوري مركزي دار القراءة، في قرية لوہنه من نواحي جنك فور (نيفال) وزرتها و رأيت نظام تعليمها و تدريبها. لاحظت الطلبة وشئونهم الدراسية والأساتذة و شغفهم حبا مع المدرسة و حثهم الطلبة وتشويقهم إلى نيل الأهداف العالية المرموقة و طلب المرام المنشودة فملأ فؤادي ابتهاجا و سرورا و فرحت فرحانا كثيرا لا أمتلك أن أعربه ولا أجد كلمة تستغرق به.

سمعت بعضا من طلاب المركز سورا من القرأن الكريم فصادفتهم أنهم يسلكون مسلك القراء و يتلون القرأن الكريم مراعين بالتجويد و الأوقاف فأقدم إلى حضرتكم أزكى التهنئات و أجمل التبريكات بأنكم أنتم وردة حمراء في جردة قفراء من أرض صلبة لا ماء فيها ولا كلاء، و أسست مركزا عظيما للقراءة و التحفيظ في بلدة نيبال الشال، ثم أحييكم مرة أخرى تحية طيبة وسائر المؤمنين الذين ساهموكم في تأسيسها وتطويرها إلى هذه المرحلة.

أدعو الله تعالى عز وجل أن يبلغ هذا المركز إلى ذروة الكمال وأن يمطر سحابه على الأقطار و الأمصار شرقا و غربا خاصة على نيپال و يجعله قمرا منيرا و أساتذته سرجه و طلابه نجومه و يعصمه عن أعين

الحساد و الأشرار، والله ولي التوفيق وهو المستعان وعليه التكلان

العبد المذنب المفتقر إلى ربه النصير محمد رضا القادري المصباحي بن

مولانا محمد عیسٰی البرکاتي

المتوطن: کپٹول، دھنوشا، نیپال، رئیس المدرسین فی جامعة

حضرت نظام الدین أولیاء

شارع رقم ۲۲، ذاکر نغر، دلهي الجديدة ۲۵

رقم الجوال: ۹۷۱۷۵۶۰۳۰۱/۰۱۱۷۹۹۶۶۱۶۱

والمأمور بالإفتاء في إدارة شرعية دلهي

التاريخ: ۱۹ من آذار (مارس) سنة ۲۰۱۰م، يوم الجمعة المباركة

نوٹ: یہ وضاحت ضروری ہے کہ فقیر نے مدرسہ فیض النبی نوری مرکزی دارالقرأت کے حوالے سے یہ تأثر اس وقت لکھا تھا، جب پہلی بار اسے زیارت کا موقع ملا تھا، بغیر کسی سابقہ دعوت کے از خود چل کر ادارہ کا جائزہ لیا، اس وقت مہتمم ادارہ، حضرت قاری نسیم احمد صاحب وہاں موجود بھی نہیں تھے، نہ ان کو میری آمد کی خبر تھی، نہ ان سے میری زیادہ شناسائی تھی، بلکہ چند ملاقاتیں ''کما'' میں زمانہ طالب علمی میں ہوئی تھیں۔

حیات مؤلف-ایک نظر میں

بقلم خود

نام ونسب: محمد رضا قادری

پیدائش: ۹/ ذوالحجہ ۱۴۰۴ھ شب جمعرات مطابق ۵/ستمبر ۱۹۸۴ء۔ لیکن سندوں میں دی گئی تاریخ پیدائش ۳/ فروری ۱۹۸۴ء ہے۔

والد ماجد: حضرت مولانا محمد عیسٰی برکاتی، مرید باصفا حضور سید العلما سید شاہ آل مصطفی برکاتی مارہروی قدس سرہ

والدہ ماجدہ: زبیدہ خاتون قادری بنت محمد خورشید عالم بن محمد ہارون بن کتاب علی بن شبراتی میاں

جد مکرم: ذوالمجد والمکارم، حضرت محمد صدیق قادری رضوی قدس سرہ (ولادت: ۱۹۲۱ء تخمیناً وفات: ۱۰/ صفر المظفر ۱۴۳۵ھ مطابق ۱۳/ دسمبر ۲۰۱۳ء بروز جمعہ شب شنبہ۔ ۲۸/ گتے اگہن بکرم سنبت ۲۰۷۰ سال، ۷ بجکر ۱۵ منٹ پر

پردادا: محمد جان بن مولانا محمد مہدی میاں بن پَرْحَسَن میاں بن نَجُم میاں بن جھلّو میاں

خاندانی پس منظر: راقم سطور کے آبا واجداد کا تعلق ملک یمن سے ہے۔ عاصم بن فرج جُحنی یمنی کی اولاد میں سے ''طلحہ بن عدی'' بغرض تجارت سلطان شمس الدین التمش کے عہد میں ہندوستان تشریف لائے۔ ان کی اولاد میں سے حضرت نون علی رحمہ اللہ نے لگ بھگ پانچ سو سال قبل دارالحکومت نیپال ''کاٹھمنڈو'' کو اپنا مسکن بنایا اور کاٹھمانڈو کے ضلع ''لَلِت پور'' میں قیام فرمایا۔ خاندانی روایات اور بزرگوں کے ذریعہ یہ معلوم ہوا کہ نون علی کے دو لڑکے ہوئے فہد بن نون اور سعد بن نون ان میں سے کسی ایک کی اولاد نے بہار و نیپال کی سرحد پر واقع موضع ''مٹیہانی''، ضلع مہوتری میں بود و باش اختیار کی، یہاں کتنے دنوں تک آباد رہے کچھ معلوم نہیں، جد امجد کی زبانی کثیر مرتبہ یہ سننے کو ملا کہ ہمارے آبا و اجداد ایک زمانے تک کاٹھمنڈو کے ضلع لَلِت پور میں مقیم رہے۔ انھوں نے فرمایا کہ لگ بھگ ڈھائی سو سال پیشتر

جھلّو میاں نے مٹیہانی گاؤں سے اپنے بچوں کے ساتھ ہجرت فرما کر ضلع دھنوشا کی پنچایت اوڑھی وارڈ نمبرے میں واقع ''کپٹول'' نامی گاؤں میں سکونت اختیار کرلی جہاں پہلے سے کوئی مسلمان آباد نہ تھا بلکہ یہاں کیوٹ برادری اور دیگر غیر مسلم قومیں آباد تھیں۔ آپ کے آباد ہونے کے بعد ایک اور مسلم خاندان ''بھٹاموڑ'' کے قریب موضع ''بھٹا'' سے ہجرت کر کے یہاں سکونت پذیر ہوا اور آج یہاں انھیں دونوں خاندان کی نسلیں آباد ہیں۔ مرور ایام اور حوادث زمانہ کے باوجود عربوں کی بعض خصوصیات اس خاندان میں محسوس کی جاسکتی ہیں، مثلاً حیرت انگیز قوت حافظہ، علم الانساب میں مہارت، فقیر کے جد امجد کا حافظہ اس قدر قوی تھا کہ پورے گاؤں کے خاندانوں کے شجرہائے نسب چھ سات پشتوں تک، بالتفصیل لکھوادیے، کون کب، کہاں سے آیا، کس کی اولاد کتنی ہوئیں، کون کہاں مرا؟ وغیرہ، تیسری خصوصیت مہمان نوازی، چوتھی خصوصیت صوتی حلاوت یہ باتیں ہمارے خاندان میں اوپر سے چلی آرہی ہیں۔ باقی علم و عمل اور فضل کے اعتبار سے بھی یہ خانوادہ معروف ہے۔ میرے لکڑ دادا حضرت مہدی میاں، اپنے زمانے میں علاقہ بھر کی مذہبی ضرورت پوری کیا کرتے تھے۔ جد امجد نے فرمایا: کہ ان کے دادا گھوڑے سے سفر فرماتے اور دربھنگہ ضلع تک کے علاقوں کا تبلیغی دورہ فرمایا کرتے تھے۔ کوئی قرآن مجید پڑھنے میں غلطی کرتا تو فوراً اسے ٹوکتے۔ میلاد، فاتحہ، نکاح اور جنازہ لوگوں کی پڑھاتے تھے۔ ان کے پوتے اور میرے جد امجد حضرت محمد صدیق قدس سرہ اپنے زمانے کے بڑے باخبر لوگوں میں سے تھے۔ ان کی ذہانت و فطانت اور قوت حافظہ کی نظیر پورے علاقہ میں نہیں تھی، اور علم ریاضی میں ان کا پایہ بہت بلند تھا، بڑا زرخیز دماغ پایا تھا۔ کروڑوں کا حساب وہ سکنڈوں میں زبانی بتادیا کرتے تھے۔ ریاضی کے مشکل مسائل کو وہ چٹکیوں میں حل فرماتے تھے۔ سنسکرت اور ہندی زبانوں سے اچھی طرح واقف تھے ساتھ ہی ساتھ وید و پران جیسی کتابوں کی لمبی لمبی عبارتیں انھیں یاد تھیں۔ صوم وصلوۃ کے پابند اور درود شریف کے عامل تھے۔ تقریباً ۴۰۰ سے ۵۰۰ مرتبہ درود شریف پڑھ کر سونا ان کے معمول میں شامل تھا۔ بہت بے خوف اور دلیر انسان تھے، متعدّد بار شیطانوں نے رات کے وقت میں آپ کا راستہ روکنے

کی کوشش کی اور ڈرایا مگر آپ ان سے خائف نہیں ہوئے، بلکہ ان کے سامنے مقابلہ کے لیے کھڑے ہوگئے جب تک شیطان غائب نہیں ہوجاتا آپ چاقو یا لوہے کی کسی چیز کو اس کی طرف تان کر کھڑے رہتے تھے۔ علما اور مہمان نواز تھے۔ اگر آپ پڑھتے لکھتے تو اپنے عہد کے بہت بڑے عالم دین ہوتے والد کا بچپن ہی میں وصال ہوگیا اور کسب معاش کے لیے ابتدائی تعلیم بھی ترک کردینی پڑی۔ جدامجد نے راقم سطور سے فرمایا کہ پورا بغدادی قاعدہ ایک سے دو دن میں ہم نے استاذ کو سنا دیا اور کہا یہ تو جوڑتی ہے ہے۔ والد ماجد اپنے اسلاف کے نقش قدم پر ہیں، ان کی دینی وعلمی خدمات کو بیان کرنے کے لیے ایک دفتر چاہیے۔ میرے عم مکرم حضرت مفتی محمد عثمان برکاتی مصباحی بلند پایہ عالم دین، متعدّد مدارس ومساجد کے بانی ہونے کے ساتھ ملک نیپال کے عظیم دینی ادارہ مرکزی ادارۂ شرعیہ، کاٹھمانڈو کے چیف قاضی ومفتی کی حیثیت سے خدمت انجام دے رہے ہیں۔ آپ کی خدمات پر تفصیلی مقالہ لکھا جاسکتا ہے۔

تدریسی خدمات: اکتوبر ۲۰۰۹ء سے اگست ۲۰۱۴ء تک ہندوستان کی معروف دعوتی درسگاہ جامعہ حضرت نظام الدین اولیا، ذاکر نگر، نئی دہلی میں بحیثیت پرنسپل وڈائرکٹر تعلیمات تدریسی خدمت انجام دی اور تخصص فی الادب والدعوہ کے طلبہ کو عربی زبان وادب، نحو وصرف، ترجمہ، علوم قرآن اور تاریخ عربی ادب جیسے موضوعات کو پڑھایا۔ ۱۰ر جنوری ۲۰۱۵ء سے ارباب حل وعقد مادر علمی جامعہ اشرفیہ کی طلب پر حاضر ہوکر تدریسی خدمات کا آغاز کیا، ہنوز یہیں تدریسی خدمت سے وابستہ ہیں۔

فتاوی نویسی: ۱۴ر فروری ۲۰۱۰ء کو عمائدین اہلسنت کی موجودگی میں ادارۂ شرعیہ دہلی کی ذمہ داری سونپی گئی جس کے بعد سینکڑوں مسائل کے جوابات یہاں سے دیے۔ اگست ۲۰۱۴ء تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ افسوس یہ کہ اس زمانہ کے فتاوی کا رجسٹر ایک بنگالی طالب علم کو نقل کے لیے دیا گیا جس کو انھوں نے گم کردیا یا کسی طرح سے گم ہوگیا جواب تک مفقود ہے۔

مشاہیر اساتذہ: محدث جلیل، علامہ عبدالشکور مصباحی، سابق شیخ الحدیث، جامعہ اشرفیہ، مبارک پور، خیر الاذکیا، علامہ محمد احمد مصباحی، سابق صدر المدرسین، جامعہ ہذا، سراج الفقہا،

حضرت مفتی محمد نظام الدین رضوی، صدر المدرسین، جامعہ ہذا، حضرت مولانا محمد اسرار الحق صاحب لہراوی، حضرت مولانا قاری مقری نور الحق مصباحی قدس سرہ، حضرت مولانا عبد الحق مصباحی، حضرت مولانا مفتی محمد بدر عالم مصباحی، حضرت مولانا صدر الوری مصباحی، حضرت مولانا نفیس احمد مصباحی، (اساتذۂ مبارک پور) حضرت مولانا قاری مقری احمد جمال عزیزی مصباحی، مفتی آل مصطفی مصباحی، حضرت مولانا محمد صدیق مصباحی، حضرت مولانا عبد الرحمٰن مصباحی (اساتذۂ جامعہ امجدیہ، گھوسی) حضرت مولانا فروغ احمد اعظمی، حضرت مولانا تفسیر القادری قیامی، حضرت مولانا محمد قمر عالم اشرفی (اساتذۂ جمدا شاہی) حضرت مولانا عرش محمد صاحب، حضرت مولانا خورشید عالم مصباحی، حضرت مولانا محمد جعفر صادق (اساتذۂ مدرسہ عربیہ ضیاء العلوم، ادری) حضرت مولانا صوفی عزیز الرحمٰن صاحب، حضرت مفتی محمد عثمان برکاتی مصباحی، حضرت مولانا احمد حسین برکاتی (اساتذۂ نیپال)۔ اپنے عصر کے چند مشائخ سے تبرکا بھی پڑھنے کا شرف حاصل ہوا مثلا حضرت محدث کبیر، ممتاز الفقہا، علامہ ضیاء المصطفی قادری دامت برکاتہم سے بخاری شریف کے متعدّد اسباق، حضرت بحر العلوم، مفتی عبد المنان اعظمی قدس سرہ سے الاشباہ والنظائر کا ایک سبق۔

قاعدہ بغدادی سے یسرنا القرآن تک کی تعلیم

تعلیم وتربیت: مقامی مکتب میں حضرت مولانا محمد حسن رضا مرحوم (ساکن، چتری، ضلع سرہا) اور حضرت مولانا محمد داؤ حسین صاحب (ساکن ہنسپور، ضلع دھنوشا) سے اور گھر پر والدہ ماجدہ سے حاصل کی۔ قرآن مجید، فارسی اور ابتدائی اردو کی کتابیں اپنے حقیقی عم مکرم حضرت مولانا محمد احمد حسین برکاتی سے ''اورنگ''، ضلع سرہا، نیپال نام کی بستی میں پڑھیں۔ حفظ قرآن کا باضابطہ آغاز غالبًا ۱۹۹۴ء میں جنت نظیر کشمیر کے ضلع جموں توی میں واقع دینی درسگاہ مدرسہ اسلامیہ، غوثیہ، کالج، رانجن میں حضرت قاری ابرار صاحب رامپوری کی درسگاہ میں کیا۔ اور تکمیل حفظ دار العلوم حامدیہ، جگدر بازار، میں حضرت حافظ قاری محمد اظہار احمد صاحب کی درسگاہ میں کی،

جب کہ دورۂ قرآن، کامل ایک سال، جامعہ اشرفیہ مبارک پور میں حضرت حافظ محمد عمر مبارک پوری دام ظلہ العالی کی بافیض درسگاہ میں کیا۔

سندوں کی تفصیلات: ڈویژن

سند حفظ قرآن: الجامعۃ الاشرفیہ، مبارک پور، اعظم گڑھ، یوپی ۱۹۹۹ء اعلی

مولویت: دار العلوم علیمیہ، جمدا شاہی، ضلع بستی، یوپی ۲۰۰۳ء اعلی

سند عالمیت: الجامعۃ الامجدیۃ الرضویہ، گھوسی، ضلع مئو، یوپی ۲۰۰۵ء ممتاز

سند روایت حفص: الجامعۃ الامجدیۃ الرضویہ، گھوسی، ضلع مئو، یوپی ۲۰۰۵ء ممتاز

سند فضیلت: الجامعۃ الاشرفیہ، مبارک پور، اعظم گڑھ، یوپی ۲۰۰۷ء اعلی

سند قراءت سبعہ: الجامعۃ الاشرفیہ، مبارک پور، اعظم گڑھ، یوپی ۲۰۰۷ء ممتاز

سند اختصاص فی الفقہ: الجامعۃ الاشرفیہ، مبارک پور، اعظم گڑھ، یوپی ۲۰۰۹ء اعلی

بی اے آنرز (اسلامک اسٹڈیز) جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۲۰۱۴ء

ایم، اے (تاریخ) مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد ۲۰۱۸ء

اترپردیش عربی فارسی مدرسہ بورڈ سے: منشی، مولوی، عالم، کامل، فاضل دینیات، فاضل معقولات

شہادۃ نجاح، الازہر انسٹی ٹیوٹ، بدایوں شریف، ۱۱ر فروری ۲۰۰۷ء ممتاز مع الشرف

۸ تا ۱۱ر فروری ۲۰۰۷ء کو الازہر انسٹی ٹیوٹ، بدایوں شریف کی طرف سے شہید بغداد عالم ربانی حضرت مولانا اسید الحق محمد عاصم قادری ازہری نور اللہ مرقدہ کے زیر اہتمام آل انڈیا مقابلہ علوم حدیث مابین طلبۂ مدارس و جامعات منعقد ہوا جو پانچ مرحلوں میں منقسم تھا، راقم سطور نے تمام مراحل طے کرتے ہوئے مقابلے میں اول پوزیشن حاصل کی جس سے مادر علمی اور وطن عزیز کا نام روشن ہوا۔ دس ہزار روپے نقد مع توصیفی اسناد و کتب بدست حضرت سید محمد اشرف مارہروی برکاتی بطور انعام دیے گئے۔

ڈپلومہ ان پروفیشنل عربک کورس، دوسالہ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی ۲۰۱۳ء

بیعت و ارادت: ۱۶؍رجب المرجب ۱۴۲۱ھ / ۱۵؍اکتوبر ۲۰۰۰ء کو شب میں جانشین فاتح بلگرام، رئیس الاتقیا حضرت مولانا سید شاہ محمد اویس مصطفی قادری صغروی، دامت برکاتہم العالیہ، سجادہ نشیں خانقاہ عالیہ قادریہ چشتیہ، بڑی سرکار، بلگرام شریف کے دست حق پرست پر مدرسہ عربیہ اظہار العلوم جہاں گیر گنج میں بیعت کی، جب کہ میری عمر صرف ۱۶؍سال کے قریب تھی۔

بیعت سلوک: داعی اسلام، قدوۃ السالکین، شیخ طریقت حضرت مولانا صوفی شاہ محمد ظہیر عالم قادری برکاتی، زیب مسند ارشاد خانقاہ عالیہ قادریہ چشتیہ راہ سلوک، چاند پور، ضلع مرادآباد، یوپی کے ہاتھ پر ۲۰۱۱ء کے اواخر میں بیعت سلوک کا شرف حاصل کیا اور سلوک کی پوری تربیت انھیں سے حاصل کی۔

بیعت سلوک نقشبندیہ: ۱۰؍مارچ ۲۰۱۱ء کو شیخ العالم، قدوۃ العرفا حضرت مولانا شاہ احمد رضا خان نقشبندی مجددی دامت برکاتہم العالیہ۔ سجادہ نشیں خانقاہ عالیہ نقشبندیہ مجددیہ خیریہ، کمال پور شریف کے ہاتھوں پر سلسلۂ نقشبندیہ میں طالب بیعت ہوا۔

اجازت وخلافت: (۱) سلسلۂ عالیہ قادریہ رضویہ نوریہ

خلیفۂ حضور مفتی اعظم ہند، حضرت مفتی قاضی غلام یس صاحب، قاضی شہر بنارس دام ظلہ العالی

مؤرخہ ۲۷؍نومبر ۲۰۱۵ء بمقام جنک پور، نیپال

(۲) سلاسل عالیہ قادریہ، چشتیہ، رزاقیہ، سلیمانیہ، فردوسیہ، نقشبندیہ

نبیرۂ حضرت قاضی حمید الدین صدیقی ناگوری دہلوی، حضرت صوفی شاہ محمد رئیس احمد قادری چشتی برکاتی صدیقی، دہلوی (وصال: ۴؍محرم الحرام ۱۴۴۰ھ مطابق ۱۳؍ستمبر ۲۰۱۸ء)

خلیفہ ذاکر خاندان برکات، مفتی مظفر احمد داتا گنجوی، بدایونی (۱۹۳۲ء-۱۴۲۷ھ)

مؤرخہ ۸؍شوال المکرم ۱۴۳۹ھ بمقام چاند پور، مرادآباد

(۳) سلسلۂ قادریہ رضویہ نوریہ

حضرت مفتی محمد انوار الحق مصطفوی، پیچی باغ، بریلی شریف، یوپی
مؤرخہ:۹/ شعبان ۱۴۳۹ھ مطابق ۲۶/ اپریل ۲۰۱۸ء بمقام بست پور، سرلاہی، نیپال
(۴) اجازۃ الطریقۃ القادریۃ
فضیلۃ الشیخ السید الشریف احمد فتاح فرج الشیخلی البغدادی قدس سرہ (م ۲۷/ فروری ۲۰۲۱ء)
۶/ صفر المظفر ۱۴۴۱ھ بمقام دولت خانہ صوفی سلطان چشتی، الہ آباد، یوپی
اجازۃ الطریقۃ الرفاعیہ، حضرت سید احمد فتاح فرج الشیخلی البغدادی، ۷/ صفر المظفر ۱۴۴۱ھ
(۵) اجازۃ الطریقۃ القادریۃ الرضویہ
محدث جلیل، استاذ الاساتذہ، حضرت علامہ عبدالشکور مصباحی حفظہ اللہ و رعاہ، شیخ الحدیث، جامعہ اشرفیہ، مبارک پور
مؤرخہ ۷/ صفر المظفر ۱۴۴۱ھ بدولت خانۂ حضرتِ اقدس الہ آباد
(۶) اجازۃ الطریقۃ النقشبندیۃ المجددیۃ
قدوۃ العرفا، شیخ العالم، حضرت مولانا شاہ احمد رضا خان الخالدی النقشبندی المجددی، دامت برکاتہم العالیہ
مؤرخہ ۸/ مارچ ۲۰۲۱ء مطابق ۲۴/ رجب المرجب ۱۴۴۲ھ بمقام خانقاہ نقشبندیہ مجددیہ، خیریہ، کمال پور شریف، تحصیل نارائن پور، ضلع مرزاپور، یوپی

قلمی نگارشات -تحقیق، تالیف، ترجمہ وتعلیقات از سنہ ۲۰۰۴ء تا ۲۰۲۱ء

۱. شرح ہدایۃ النحو (بحث، اسم وفعل وحرف) سنہ تالیف ۲۰۰۴ء زیر طبع
۲. زبدۃ مباحث القطبی سنہ تالیف ۲۰۰۴ء زیر طبع
۳. ترجمہ وتعلیق علی مدارک التنزیل سنہ تالیف ۲۰۰۶ء غیر مطبوعہ
۴. شرح وتعلیق علی تفسیر القاضی البیضاوی سنہ تالیف ۲۰۰۷ء غیر مطبوعہ

۵. ترجمہ وشرح دیوان الحماسۃ لأبي تمام سنہ تالیف ۲۰۰۷ء غیر مطبوعہ
۶. دروس بخاری شریف سنہ تالیف ۲۰۰۷ء غیر مطبوعہ
۷. حاشیہ مجانی الادب (عربی) سنہ تالیف ۲۰۰۹ء غیر مطبوعہ
۸. امام احمد رضا کا فقہی کمال فتاوی رضویہ ج ہفتم کے آئینے میں سنہ تالیف ۲۰۰۹ء زیر طبع
۹. الفیوض الجیلانیۃ فی الفتاوی القادریۃ سنہ تالیف ۹-۲۰۰۸ء زیر طبع
۱۰. قادری ڈائری (روزنامچے) سنہ ترتیب از ۲۰۰۶ء تا ۲۰۱۵ء زیر طبع
۱۱. تذکرہ حضرت محمد صدیق قادری ومسلمانان کپٹول سنہ تالیف ۲۰۱۲ء زیر طبع
۱۲. حاشیہ تاریخ الادب العربي لأحمد حسن الزیات، ڈیڑھ سو صفحات کا (بزبان عربی) ۲۰۱۴ء غیر مطبوعہ
۱۳. مدارس اسلامیہ کا نصاب تعلیم، نظام تدریس اور نظام مالیات سنہ تالیف ۲۰۱۵ء غیر مطبوعہ
۱۴. التصوف یکافح الإرھاب ویتحدی التطرف الفکري سنہ تالیف ۲۰۱۶ء مطبوعہ
۱۵. نیپال میں اسلام کی تاریخ، ۲۰۱۷ء مطبوعہ
۱۶. نیپال اور نیپالی مسلمانوں کو درپیش چیلنج ۲۰۱۸ء مطبوعہ
۱۷. The Sufism Fights the Terrorism ۲۰۱۹ مطبوعہ
۱۸. सूफीवाद आतंकवाद का अन्त करता है ۲۰۲۰ زیر طبع
۱۹. تصوف کے ذریعہ دہشت گردی کا خاتمہ اور فکری انتہا پسند کو چیلنج ۲۰۲۰ء زیر طبع
۲۰. شخصیات اسلام ۲۰۲۰ء زیر طبع
۲۱. تعمیر امت نیپال ۲۰۲۰ء زیر طبع
۲۲. آئینۂ شعور وآگہی ۲۰۲۰ء زیر طبع
۲۳. اقوال حکمت سنہ تالیف ۲۰۲۰ء زیر طبع
۲۴. منہاج السالکین شرح منہاج العابدین ۲۰۲۰ء غیر مطبوعہ

۲۵. تفسیر القرآن الکریم۔(پارہ،۲۸،۲۹،۳۰) تقریباً ایک ہزار صفحات پر مشتمل قرآن کریم کی علمی، فکری، لسانی، بلاغی اور سائنٹفک تفسیر۔۲۰۲۰ء غیر مطبوعہ
۲۶. القول الصحیح فی تعیین الذبیح سنہ تالیف ۲۰۰۷ء غیر مطبوعہ
۲۷. الموجز فی فقہ اللغۃ العربیہ زیر ترتیب
۲۸. اسفار و مشاہدات ۲۰۲۱ء غیر مطبوعہ
۲۹. الخطبات العزیزیۃ العربیۃ للجمعہ غیر مطبوعہ
۳۰. یادوں کے نقوش ۲۰۲۱ء غیر مطبوعہ

موجودہ مشغلہ: تدریس، تصنیف، تحقیق، عزیز المساجد، جامعہ اشرفیہ میں جمعہ کی امامت و خطابت، دعوت و تبلیغ کے لیے اسفار، تحریک و تنظیم کی ذمہ داریاں، مباک پور میں ہر ہفتہ دو مقامات پر حلقات ذکر و فکر کا اہتمام اور عوام کی روحانی تربیت۔

عہدے اور ذمہ داریاں: مدرس جامعہ اشرفیہ، مبارک پور، رکن خانقاہ قادریہ چشتیہ راہ سلوک (انڈیا) سرپرست و خادم اعلی راشٹریہ علما کونسل، نیپال، خادم راہ سلوک سوشل ویلفیر سوسائٹی، نیپال، و سرپرست، کلیہ سیدہ فاطمہ للبنات، جلیشور، ضلع مہوتری، نیپال

ازدواجی زندگی: مؤرخہ ۱۴/ جون ۲۰۰۴ء کو الحاج محمد رفیق برکاتی صاحب، ساکن، لوکہا بازار، ضلع مدھوبنی بہار کی صاحبزادی، نازنین بیگم قادری سے عقد نکاح ہوا جن سے (۱) غلام محی الدین جیلانی (۲/ جولائی ۲۰۰۶ء) (۲) محمد ارشد القادری (۲۶/ جون ۲۰۱۰ء) (۳) عائشہ فاطمہ (۱۶/ جون ۲۰۱۲ء) (۴) شاہ ولی اللہ (۲۷/ اگست ۲۰۱۵ء) (۵) زہرا بتول قادری (۹/ جون ۲۰۲۰ء) پیدا ہوئے۔

برادران و ہمشیرگان: ۱۔ محمد حامد رضا ۲۔ محمد عاشق رضا۔ حامد رضا پیدائش کے ایک ڈیڑھ ماہ بعد اور عاشق رضا پیدائش کے چند لمحوں بعد وصال کر گئے۔ ۳۔ فاضلہ قاریہ، مقتیہ مہر النسا امجدی، پرنسپل کلیہ فاطمۃ الزہرا للبنات، جنک پور ۴۔ فاضلہ قاریہ زیب النسا امجدی، نائب پرنسپل کلیہ فاطمۃ الزہرا للبنات، جنک پور، دونوں درجۂ فضیلت تک درس دیتی ہیں۔

اسفار و زیارات: اجمیر شریف، مارہرہ شریف، بلگرام شریف، بریلی شریف، دہلی شریف، کلیر شریف، دیوہ شریف، بدایوں شریف، کچھوچھہ شریف - ممبئی، کلکتہ، حیدرآباد، سری نگر، جموں، کاٹھمانڈو، پوکھرا، براٹ نگر، بٹول

کشمیر، مہاراشٹر، دہلی، ہریانہ، اتراکھنڈ، جھارکھنڈ، اڑیسہ، بنگال، بہار، کرناٹک، گجرات، پنجاب تلنگانہ بشمول اترپردیش ریاستوں کے اسفار، نیپال میں پردیس نمبر۱، ۲، ۴، ۵ میں اسفار ہوئے۔

عراق مقدس (۲۰۱۹)، بغداد شریف، کرخ، مدین، کاظمین، بابل، نجف اشرف، کربلائے معلی وغیرہ۔

دوحہ، قطر (۲۰۱۹ء)۔

دبئی (۲۰۱۹ء)